ماہنامہ

انوار مدینہ

لاہور

بلغ العلی بکمالہ
کشف الدجی بجمالہ
حسنت جمیع خصالہ
صلو علیہ وآلہ

نگرانِ اعلیٰ

حضرۃ مولانا سید حامد میاں مدظلہ مہتمم و شیخ الحدیث جامعہ مدنیہ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

جلد : ۳
شمارہ : ۲
قیمت : ۶۵ پیسے

ماہنامہ
انوارِ مدینہ
لاہور

رجب ۱۳۹۲ھ
اگست ۱۹۷۲ء
فون : ۶۲۹۳۲

مدیرِ اعزازی : پروفیسر یوسف سلیم چشتی
مدیرِ معاون : حبیب الرحمٰن اشرف

اس شمارے میں

اداریہ ---------- ۲
کچھ "انوارِ مدینہ" کے بارے میں ---------- ۵
اُولٰئِکَ ھُمُ الراشدون ---- حضرت مولانا سید محمد میاں مدظلہٗ ---- ۷
اسلامی نظامِ عدالت ---- حضرت مولانا محمد مرزا گل مدظلہٗ ---- ۱۷
الشفاء ---- محترم نور محمد غفاری ---- ۲۷
فضیلتِ علم اور اہلِ علم ---- حضرت علامہ مولانا شمس الحق افغانی مدظلہٗ ---- ۳۲
جمہوریت اپنے آئینے میں اور الخ .... حضرت مولانا سید محمد میاں مدظلہٗ ---- ۳۹
انوارِ مدینہ ---- حضرت مولانا محمد موسیٰ مدظلہٗ ---- ۵۲
تعارف جامعہ مدنیہ ---- محترم الحاج محمود احمد عارف ---- ۵۳
تبصرہ ---------- ۵۴

سید حامد میاں مہتمم جامعہ مدنیہ طابع و ناشر نے مکتبہ جدید پریس لاہور سے چھپوا کر
دفتر ماہنامہ انوارِ مدینہ، جامعہ مدنیہ کریم پارک لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

بدحالی کا علاج

نحمدہٗ و نصلّی علیٰ رسُولہ الکریم

اہم ترین حالات اور افسوسناک واقعات جو گذشتہ ماہ کراچی اور وسط سندھ میں رونما ہُوئے ہم سب کو پیامِ بیداری دے گئے۔

لیکن کیا ہم حالات کے احتجاج سے سبق لیتے ہیں اور ہمارے لیے مشرقی پاکستان کا المیہ قیامت تک کے لیے ایک درس نہ تھا، کیا وہ تمام اہل پاکستان کی پیشانی پر بدنما داغ نہیں ہے، لیکن ہم اپنے دِلوں کو ٹٹولیں تو وہ اس احساس سے خالی ملیں گے۔ ان میں نہ شرم وحیاء کی روح ہے نہ ایمان کی، صحیح بات تو یہ ہے کہ یہ بے حسی سقوطِ مشرقی پاکستان سے بھی بڑا المیہ ہے۔ یوں لگتا ہے کہ اہلِ پاکستان صرف ذاتی اغراض کے بھُوکے ہیں اور جو کچھ سامنے آجائے وہ ان کا نقد وقت اور شکار ہدف ہوتا ہے۔

ہم بے لگامی، بے اصولی کے عادی اور بے حسی، فرقہ بندی اور تفرقہ کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ اگر ہم ہوش میں آگئے اور اسلام کی یگانگت کو اپنا لیا تو ہم تلافیٔ مافات بھی کرلیں گے اور ترقی کرجائیں گے ورنہ جو حشر مشرقی بازو کا ہوا (خدانخواستہ) ہم اس سے دُور نہیں۔

صدر نے بہت مستحسن کوشش کی (اور کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ اور پہلے ایسا کرلیتے) کہ سندھ کا دورہ کیا۔ لوگوں کو نرم وگرم انداز میں سمجھایا بجھایا اور اختلافات کی آگ سرد کردی۔

لیکن یہ اس کا ناکافی حل ہے۔ صحیح حل یہ ہے کہ لوگوں کو اسلام پر چلایا جائے۔ اس مساواتِ محمدّی پر گامزن کردیا جائے جو ہماری خیالی گزرگاہوں میں نہیں بلکہ سرکارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گلیوں میں ملتی ہے اور صرف آپؐ کی تعلیمات پر چل کر ہی اسے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ وہی بدحالی کا علاج اور ہر مرض کا تریاق ہے۔ اسی سے جاہل عربوں کی کایا پلٹی اور وہ ہی تعلیم اگر اس پر عمل کے دروازے بھی کھول لیے جائیں تو ہمیں آج بھی ساری دنیا کی سروری دلانے کا واحد ذریعہ ہے۔ خُدا ہمیں اور ہمارے حکام کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی توفیق دے۔ آمین

مِصر اور لیبیا کا ادغام

کرنل قذافی کا کوئی ایک ہی عظیم کارنامہ نہیں ہے بلکہ ان کے اس سے پہلے بھی وہ جو اقدامات کرتے رہے ہیں سب ہی عظیم تھے، لیکن لیبیا کے مصر کے ساتھ ادغام میں تو عجیب بے مثال بے نفسی کا مظاہرہ ہے۔ کہ لیبیا نے اپنے تمام وسائل آمدنی یہودیوں کے خلاف جہاد فی سبیل اللہ کے لیے وقف کر دیئے اور اپنے آپکو اسلام کے لیے قربان کر دیا۔

کرنل قذافی نے (خدا ان کی عمر دراز کرے) تمام ممالک اسلامیہ کو ایک نئی دعوتِ فکر دی ہے کہ وہ اپنی اغراض نفسانیہ اور حب جاہ و منال چھوڑ کر وقت کے تقاضے کو پہچانیں اور خود کو اسلام کے لیے قربان کر کے حیاتِ جاوداں بخشیں۔

خدا کا شکر ہے کہ ہمارے دَور میں ایسی شخصیت سامنے آئی ہے جس کی نظیر قرونِ اولیٰ کے سوا ملنی مشکل ہے۔ ان کے اس عمل نے ٹمٹماتے چراغ میں تیل کا کام دیا ہے۔ کثّر اللہ امثالہٗ خدا ان کے اخلاص کو قبول کرے اور ان کو دونوں جہان میں اسکا صلہ دے۔ ان کے ہاتھوں یہ موقع آئے کہ مسلمان اسرائیل سے اپنا کھویا ہوا علاقہ واپس لیں ؏

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

نہایت ہی افسوسناک حادثہ ہے کہ حضرۃ مولانا حافظ حبیب اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ (خلفِ اکبر شیخ التفسیر حضرۃ مولانا احمد علی صاحب لاہوری قدس سرہٗ) مجاور مکہ معظمہ ۲۰ جولائی بروز پنجشنبہ صرف دو تین روز زیادہ علیل رہ کر اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئے۔

سات آٹھ سال ہُوئے کہ انہوں نے ایک دفعہ گرمیاں مکہ معظمہ میں گزاریں۔ دن بھر شدید گرمی میں طواف معمول رہا، گرمی کے بدرقہ کے لیے اِملی کا شربت زیادہ استعمال فرماتے رہے جس کا اثر موسم سرما میں یہ ظاہر ہوا کہ بدن میں درد رہنے لگا۔ یہ ان کی علالت کا آغاز تھا۔

ان کے زُہد و جذبۂ عبادت و ریاضت نے انہیں پھر بھی اپنے بدنی معالجہ کی فرصت نہ دی ادھر جیسے یہ جذبہ عروج پر تھا بیماریوں نے زور پکڑنا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ دل پر بھی کچھ اثر محسوس

فرمانے لگے، مگر وتبتل الیہ تبتیلا مطمح نظر رہا اور ایک ایک کر کے سب سے ہی طبیعت لاتعلق ہوتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ صرف ایک ہی ذات پر نظر رہ گئی اور اسی خالق حقیقی سے روح مبارک جا ملی ۔ رحمہ اللہ تعالےٰ رحمۃ واسعۃ ۔

فضیلتِ مقام وفات کے لیے یہ حدیث کافی ہے ۔

من مات بمکۃ فکانما مات فی السماء۔ جس نے مکہ معظمہ میں موت پالی گویا آسمان میں اس کی موت ہوئی۔

لیکن اس کے ساتھ ایک سعادت یہ بھی نصیب ہوگئی کہ حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ کے پاس تدفین نصیب ہوئی ع پہنچی وہی پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

ہم حضرت مولانا کے جملہ پسماندگان سے اور خصوصاً ان کے برادرِ خورد حضرت مولانا عبیداللہ صاحب انور مدظلہم سے تعزیت کناں ہیں اور دعاء کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ ان کو اور سب پسماندگان کو اس صدمہ پر اجر دے۔ صبر دے اور ان کی حیات وفیوض میں برکت عطاء فرمائے ۔ آمین ۔

اسی طرح ہمارے مخلص ترین رکن جامعہ جناب حاجی عبدالحکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بھی اچانک دماغ کی رگ شق ہوجانے سے وفات ہوئی ۔ وفات کا دن اور وقت تقریباً دونوں ہی کا ایک ہے ۔ ان کے پسماندگان کے علاوہ ہر ملنے جلنے والے کو بھی ان کی وفات کا صدمہ ہے کیونکہ ان کا تعلق سب سے بہت مخلصانہ اور مخلصانہ تھا۔ خدا نے ان کو ایسی موت دی جس میں شہادت کا اجر ملتا ہے ۔

ہماری دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو شہداء وصالحین کے ساتھ محشور فرمائے اور سب پسماندگان کو صبر واجر دے ۔ آمین

نیز قارئین کرام سے استدعاء ہے کہ وُہ جس طرح حضرت مولانا حافظ حبیب اللہ صاحب کے لیے دعاء مغفرت کریں اسی طرح حاجی صاحب مرحوم ومغفور کے لیے بھی کریں۔

حامیہ

کچھ "انوارِ مدینہ" کے متعلق

حبیب الرحمٰن اشرف

محدود وسائل اور بہت سی دوسری مشکلات و موانع کے باوجود "انوارِ مدینہ" نے اپنی زندگی کا دوسرا سال مکمل کر لیا ہے۔

یہ جن نیک اور پاکیزہ مقاصد کے تحت جاری ہُوا تھا اس میں اسے کتنی کامیابی ہوئی ہے۔ ہوئی بھی ہے یا نہیں۔ اس بارے میں قارئین اور مبصرین کی رائے جو بھی ہو، لیکن ہمارے اپنے خیال میں اس کا موجودہ معیار اس بلند معیار سے کہیں کم ہے جس پر ہم اسے لیجانا چاہتے ہیں۔

ہماری خواہش اور کوشش ہے کہ اسے صوری اور معنوی ہر دو لحاظ سے نمایاں امتیاز اور فوقیت حاصل ہو، اس میں اعلیٰ، شاندار اور وقت کے تقاضوں کے عین مطابق مضامین شائع ہوں، اس کی کتابت و طباعت میں کسی بھی قسم کی خامی نہ پائی جائے۔ اس کی افادیت دائمی اور سلسلۂ اشاعت وسیع تر ہو۔

ہمیں اللہ تعالیٰ کی ذات پر کامل بھروسہ ہے کہ وہ ہماری سعی مشکور فرمائیں گے۔ اور ہمارے نیک مقاصد میں ہمیں ضرور کامیابی عطاء فرمائیں گے۔

ہمیں مسرت ہے کہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب مدظلہم مہتمم دارالعلوم دیوبند، شیخ التفسیر حضرت مولانا شمس الحق صاحب افغانی مدظلہم، محدثِ اکبر حضرت مولانا سید محمد میاں مدظلہم، مناظر اسلام حضرت مولانا لال حسین صاحب اخترؔ مدظلہم ایسے فقید المثال علماء کرام نے "انوارِ مدینہ" کے لیے اپنے علمی مضامین عنایت فرمانے کا وعدہ فرمایا ہے۔

اور حضرت مولانا عبدالمنان دہلوی، حضرت سید انور حسین نفیس رقمؔ، استاد الشعراء جناب احسان دانشؔ اور الحاج سید امین گیلانی جیسے نامور شعراء نے ہمیں اپنے مکمل تعاون کا یقین دلایا ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے علماء اہل قلم اور شعراء نے تعاون فرمانے کا وعدہ فرمایا ہے۔

ہمیں اعتراف ہے کہ رسالہ میں بعض ایسے مضامین بھی شائع ہوتے ہیں جو معیاری نہیں کہلائے جا سکتے

اس طرح بعض اوقات کتابت بھی خاطرخواہ نہیں ہوسکی، نیز بعض دفعہ اشاعت وترسیل میں بھی دیر واقع ہوتی۔ ہم ان تمام خامیوں کے خاتمہ کا تہیہ کیے ہوئے ہیں اور خدا نے چاہا تو ہم بہت جلدی "انوارِ مدینہ" کو ان تمام خامیوں سے پاک کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔

ختمِ مدّتِ خریداری | جن حضرات کی مُدّتِ خریداری ختم ہو رہی ہے انہیں عنقریب اس کی اطلاع دیدی جائے گی۔ اطلاع میں تاخیر ہونے کی صورت میں ایسے حضرات جنہیں اپنی مدّتِ خریداری ختم ہونے کا علم ہے مہربانی فرماکر اپنا چندہ (مبلغ سات روپے، طالب علم ہو تو پانچ روپے) جلد ارسال فرماکر متشکر فرمائیں۔

نیز ہم ایسے تمام معزز قارئین سے ملتمس ہیں جن کی خدمت میں اب تک رسالہ اعزازی طور پر بھیجا جاتا رہا کہ اگر وہ آئندہ چندہ ارسال فرماکر اس کی خریداری قبول فرمالیں تو بہت بہتر ہوگا۔ اس طرح سے جامعہ مدنیہ کا بوجھ بھی ہلکا ہوجائے گا اور وہ بھی اس کارِ خیر کی معاونت پر مستحق اجر وثواب ہوں گے اور ممکن ہے ان کے تعاون سے ہم رسالہ اس سے زیادہ بہتر شکل میں قارئین کی خدمت میں پیش کرسکیں۔

آخر میں ہم اپنے تمام قارئین خصوصاً حضرت اقدس مدنی قدس اللہ سرہ العزیز کے تلامیذ و متعلقین اور جامعہ کے فضلائے کرام سے ملتمس ہیں کہ وہ انوارِ مدینہ کی اشاعت بڑھانے اور حق کی اس آواز کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہچانے میں ہمارا ہاتھ بٹائیں۔ اپنے حلقۂ اثر میں اس کے خریدار بنائیں۔ اس کے لیے اشتہارات فراہم فرمائیں اور بھی جس طرح ممکن ہوسکے اعانت فرماکر مستوجب اجر ہوں۔

اذانِ سحر

• علمی سرمایہ • فکری دولت • نشانِ راہ

مولانا مفتی محمود کے ۴ انٹرویوز اور ۵ تقاریر کا مجموعہ

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے امروز
نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

آج ہی منگوائیے

عزیز پبلیکیشنز - ۵۶ - میکلوڈ روڈ - لاہور

• شستہ طرزِ تکلم
• دلنشیں طرزِ تقریر
• عام فہم زبان
• خوبصورت ٹائیٹل
• عمدہ کتابت
• دیدہ زیب طباعت

۱۲۵ صفحات
قیمت ۲/۵۰ روپے

فتنوں کی سرکوبی　　قسط: ۱۷

اُولٰئِکَ ھُمُ الرّٰاشِدُوْن

"خلافت وملوکیت" کے جواب میں!

شیخ الحدیث حضرۃ مولانا سیّد محمّد میاں ادام اللہ معالیہم

بیت المال سے اقرباء کی امداد کا معاملہ

اس سلسلہ میں جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے وہ (انشاء اللہ) ہر ایک انصاف پسند طالب حق کے اطمینان کیلیے کافی ہے۔ مزید بحث ومباحثہ کی ضرورت نہیں ہے، مگر چونکہ یہ نہایت کریہہ اور شرمناک عنوان ہے جس کے معنٰی اس کے سوا کچھ نہیں ہوتے کہ معاذ اللہ سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے بیت المال میں تصرفِ بیجا اور قومی امانت میں خیانت کی۔ اس لیے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ مودودی صاحب کے پیش کردہ دلائل کا تفصیلی جائزہ لیں۔ یہ جائزہ ہی انشاء اللہ جواب ہو جائے گا۔

اس عنوان کے تحت مودودی صاحب نے دو قول پیش کیے ہیں۔

(۱) زہریؒ کا قول　(۲) خود سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قول۔

زہری رحمہ اللہ کا قول مودودی صاحب نے "طبقات ابن سعدؒ کے حوالہ سے زہری رحمہ اللہ کا قول نقل کرکے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ ہم یہ ترجمہ ہی بلفظہ نقل کرتے ہیں۔

ترجمہ۔ حضرت عثمانؓ نے اپنی حکومت کے آخری چھ سالوں میں اپنے رشتہ داروں اور خاندان کے لوگوں کو حکومت کے عہدے دیئے اور مروان کیلئے مصر کا خمس (یعنی افریقہ کے اموالِ غنیمت کا خمس جو مصر کے صوبے کی طرف سے آیا تھا) لکھ دیا اور اپنے رشتہ داروں کو مالی عطیے دیئے اور اس معاملہ میں یہ تاویل کی کہ یہ وہ صلہ رحمی ہے جس کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ انہوں نے بیت المال سے روپیہ بھی لیا اور قرض رقمیں بھی لیں اور کہا کہ ابوبکرؓ و عمرؓ نے اس مال میں سے اپنا حق چھوڑ دیا تھا اور میں نے اس کو لے کر اقرباء میں تقسیم کیا ہے۔ اسی چیز کو لوگوں نے ناپسند کیا۔ ص ۳۲۶ و ص ۳۲۷

جائزہ | زہری رحمہ اللہ مشہور محدّث بلکہ فنِ حدیث کے امام ہیں۔ ان کا قول لامحالہ وزن رکھتا ہے، لیکن یہ کہ آیا فی الواقع یہ امام زہری کا قول ہے۔ اس کو ثابت کرنے کے لیے مودودی صاحب نے بہت سے عمل کئے ہیں ۔ ملاحظہ فرمائیے ۔

۱۔ یہ قول ابن سعد نے طبقات میں نقل کیا ہے تو مودودی صاحب کا ایک عمل تو یہ ہے کہ آپ علامہ ابن سعد کے متعلق تحریر فرماتے ہیں ۔

ابن سعد کو تمام محدثین نے ثقہ اور قابلِ اعتماد مانا ہے اور ان کے متعلق یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ روایات کو جانچ پرکھ کر لیتے ہیں اور اسی بنا پر ان کی کتاب طبقات تاریخ اسلام کے معتبر ترین مآخذ میں مانی جاتی ہے۔ (خلافت وملوکیت حاشیہ ص ۱۰۷) تفسیر و مغازی کے معاملہ میں انکی ثقاہت پر تمام محدثین ومفسرین نے اعتماد کیا ہے ۔(ص ۳۱۱)

مودودی صاحب خود تسلیم کرتے ہیں کہ یہ واقدی کے تلامذہ میں سے ہیں (ص ۳۱۱) اور تلمیذ بھی ایسے مخصوص کہ آپ کے نام کے ساتھ "کاتب[1] الواقدی" لکھا جاتا ہے۔ لیکن طبقات کے اعتبار سے وہ بہت بعد کے بن جاتے ہیں۔ "تقریب التہذیب" میں حافظ ابن حجر عسقلانی نے کہا ہے "من العاشرۃ" کہ وہ دسویں طبقہ کے ہیں۔ علاوہ اس کے انہوں نے امام زہری کا جو قول پیش کیا ہے۔ وہ خود اس کا ثبوت ہے کہ ابن سعد نقلِ روایت کے بارے میں قطعاً غیر محتاط ہیں (تفصیل آگے آرہی ہے۔)

یہ بات قابلِ تسلیم ہے کہ ان کی کتاب "طبقات کبریٰ" تاریخ اسلام کی کتابوں میں اہمیت رکھتی ہے۔ اور بہتر کتاب مانی جاتی ہے، مگر اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ تاریخ کی کتابوں میں جس طرح غیر مرتب طور پر ضعیف موضوعات کا ڈھیر لگا دیا جاتا ہے اور اختصار کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ طبقات کی ترتیب مناسب ہے، اس میں اختصار سے کام لیا گیا ہے اور موضوعات کا بھی ڈھیر نہیں ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ ضعیف اور موضوع روایتوں سے یکسر پاک ہے۔

---

[1] اس زمانہ میں پریس نہیں تھا۔ کتابیں نقل کی جاتی تھیں اور وہی فروخت ہوتی تھیں، نقل کرنا بھی ایک باعزت پیشہ تھا۔ امام بخاریؒ جیسے اکابر اساتذہ کی کتابوں کے نقل کرنے والے معین ہوتے تھے، ان کو کاتب کہا جاتا تھا۔ ابن سعد کا بھی تعلق واقدی سے تھا اس لیے ان کو کاتب الواقدی کہتے ہیں ۔ محمد میاں۔

۲۔ پہلے عمل کے بعد مودودی صاحب کا دوسرا عمل ملاحظہ فرمائیے۔ فرماتے ہیں:

یہ امام زہری کا بیان ہے جن کا زمانہ سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد سے قریب ترین تھا۔ اور محمد بن سعد کا زمانہ امام زہری کے زمانہ سے بہت قریب ہے۔ ابن سعد نے صرف دو واسطوں سے ان کا یہ قول نقل کیا ہے۔ (ص ۳۲۷)

یہ دوسرا مغالطہ یا دھول جھونکنے کی دوسری کوشش ہے۔ کسی تعمیر کے متعلق تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ حال کی تعمیر ہے۔ صرف دو پشتیں گذری ہیں اس کی تعمیر ہوئی تھی لہٰذا ابھی مضبوط ہوگی، مگر کسی روایت کے متعلق یہ کہنا سراسر مغالطہ میں ڈالنا ہے کہ صرف دو راویوں کا واسطہ ہے یا فلاں کا زمانہ فلاں سے بہت قریب ہے۔

اگر قربِ زمانہ کا اعتبار ہوا کرتا تو وہ تمام روایتیں صحیح مان لی جاتیں جو تبع تابعین کے زمانہ میں بیان کی گئیں کیونکہ ان کی روایتوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک صرف دو واسطے ہوتے ہیں۔ صحابہ کرام، پھر تابعین۔ حالانکہ موضوع روایتیں اسی زمانہ میں گھڑی گئیں۔

عبداللہ بن سبا سے لیکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک صرف ایک واسطہ پڑتا تھا۔ حضرات صحابہ کا واسطہ۔ تو عبداللہ بن سبا اور اس کے تمام جعل ساز دوستوں کی تمام روایتیں صحیح تسلیم ہونی چاہئیں ان میں چون وچرا قطعاً نہ ہونی چاہیئے۔

حضرت محترم مودودی صاحب۔ اس مغالطہ سے کیا فائدہ؟ روایت کے سلسلہ میں تو اگر ایک واسطہ بھی ہو تب بھی ضرورت توثیق کی ہوتی ہے۔ یعنی یہ کہ واسطہ ثقہ اور قابلِ اعتماد ہو ورنہ وہ روایت، روایت نہیں بلکہ اختراع اور افترا ہوگی۔ دنیا جانتی ہے تل اوجھل پہاڑ اوجھل۔

(۳) تیسرا عمل ملاحظہ فرمائیے۔ فرماتے ہیں۔

اگر یہ بات ابن سعد نے امام زہری کی طرف یا امام زہری نے حضرت عثمان کی طرف غلط منسوب کی ہوتی تو محدثین اس پر ضرور اعتراض کرتے۔

حضرت مودودی صاحب کی یہ عبرت آموز نادانی ہے۔ آپ کو محدثین کے اعتراض کا علم نہیں ہے۔ حضرات محدثین جب واقدی کو ناقابلِ اعتماد قرار دیتے ہیں تو اُن کا اعتراض تو کھلا ہوا ہے اور برابر چل رہا ہے کہ واقدی کی روایتیں قابلِ اعتبار نہیں ہیں اور اگر واقدی کسی ایسے شخص کے ذریعہ بیان کریں جس کے ثقہ ہونے کا علم نہ ہو تو وہ

ایسی ساقط اور بے کار روایت ہے کہ اس کی تردید کی بھی ضرورت نہیں۔

معترضہ | بڑی خرابی یہ ہے کہ حضرت مودودی صاحب اور ان جیسے حضرات حدیث و تاریخ میں دخل تو دیتے ہیں، لیکن مؤرخین خصوصاً محدث مورخین کے مذاق سے واقف نہیں ہیں۔ ان کے زمانہ میں حدیث و تاریخ سے جو بھی دلچسپی رکھتا تھا وہ سندوں سے بھی واقف ہوتا تھا اور رجال سند سے بھی۔ وہ سند کو دیکھ کر روایت کے صحیح یا سقیم ہونے کا فیصلہ کر لیتا تھا اور یہ مؤرخ یا محدث جب سند پیش کر دیتا تھا تو سمجھتا تھا کہ اس نے اپنا فرض انجام دیدیا۔ اب ہمارے سامنے سندیں آتی ہیں، مگر ہم رجال سند سے واقف نہیں ہوتے ہیں تو ہم ضعیف اور موضوع روایت کو بھی مستند سمجھ لیتے ہیں اور یہی پروپیگنڈہ شروع کر دیتے ہیں کہ ہم جو پیش کر رہے ہیں اس کی سند موجود ہے۔ حالانکہ سند ردّی میں ڈال دینے کے قابل ہوتی ہے۔

سخن شناس نئی دلبرا سخن اینجا ست

(۴) یہ عمل پوری فنی مہارت سے کیا ہے کہ الفاظ کی بھول بھلیاں میں رکھ کر (کہ عہد سے قریب ترین تھا اور صرف دو واسطے ہیں اس لیے اس بیان کو صحیح تسلیم کرنا ہی ہوگا) اس روایت کی اصل کمزوری اور خرابی پر پردہ ڈال دیا۔ یعنی اس سوال کو سامنے آنے ہی نہیں دیا کہ یہ دو واسطے کون ہیں؟ یہ سوال سامنے آتا ہے تو ساری فن کاری ختم ہو جاتی ہے۔

ان دو واسطوں میں پہلے صاحب جو زہری کا یہ قول نقل کرتے ہیں۔ محمد بن عبداللہ ہیں۔ محمد بن عبداللہ کون ہیں۔ ثقہ ہیں یا غیر ثقہ۔ کچھ پتہ نہیں۔ "تقریب التہذیب" میں محمد بن عبداللہ ستّر ہیں۔ ان کا امتیاز دادا یا قبیلہ وغیرہ کے انتساب سے ہوتا ہے۔ جب تک قبیلہ یا دادا وغیرہ کا علم نہ ہو تو محمد بن عبداللہ فرضی شخص بھی ہو سکتا ہے۔ کوئی بھی شخص اپنا نام محمد رکھ سکتا ہے اور اس کا باپ اللہ کا بندہ ہی ہوگا۔ لہٰذا کوئی شخص بھی محمد بن عبداللہ ہو سکتا ہے۔ ایسے راوی کو مجہول کہا جاتا ہے اور سند میں اس طرح مبہم اور مجہول نام پیش کر دینا یا اصلی نام چھپا لینا۔ تدلیس کہلاتا ہے، جو ائمہ حدیث کی نظر میں ایک ایسا عیب ہے جس کی بنا پر نہ صرف وہ روایت ساقط ہوتی ہے بلکہ اس راوی پر بھی اعتراض آجاتا ہے۔

دوسرے راوی محمد بن عمر ہیں جو واقدی کے لقب سے مشہور ہیں۔

مودودی صاحب نے غیر معتبر کو معتبر گردانے اور اپنے مقصد کو پورا کرنے کے لیے واقدی کی بھی توثیق کی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

واقدی کے متعلق یہ بات اہلِ علم کو معلوم ہے کہ صرف احکام وسنن کے معاملہ میں ان کی احادیث کو رد کیا گیا ہے۔ باقی رہی تاریخ اور خصوصاً مغازی اور سیر کا باب۔ تو اس میں آخر کون ہے جس نے واقدی کی روایات نہیں لیں۔ (ص ۱۰۷ خلافت وملوکیت)

اس ارشاد میں بھی پہلا مغالطہ تو یہ ہے کہ واقدی کی روایات تاریخ و مغازی کے باب میں تسلیم کی جاتی ہیں۔ حالانکہ تاریخ میں بھی واقدی کی روایت اس وقت لی جاتی ہے جبکہ واقدی کسی ثقہ یا کم از کم معروف یعنی غیر مجہول سے روایت کریں تو اس صورت میں اس روایت کو صرف اس بناء پر کہ واقدی روایت کر رہے ہیں، ساقط نہیں کریں گے، لیکن اگر واقدی کسی مجہول شخص سے روایت کریں یا کسی ایسے شخص سے جو مجروح قرار دیا گیا ہو یعنی کاذب یا مدلس وغیرہ مانا گیا ہو تو یہاں تو کریلا نیم چڑھا ہو جاتا ہے خود واقدی مجروح اور مجروح اور مجہول سے روایت کریں تو وہ روایت تو کسی بھی صاحبِ بصیرت کے نزدیک قابلِ اعتبار نہیں ہوگی یہاں یہی صورت ہے کہ واقدی جن سے روایت کر رہے ہیں وہ مجہول ہے لہٰذا روایت ناقابلِ اعتبار۔

اس کے علاوہ قابلِ توجہ یہ ہے کہ جب احکام وسنن کے بارے میں واقدی کی روایت ناقابلِ اعتبار ہے تو کیا ایسے معاملہ میں واقدی کی روایت معتبر ہوگی جو احکام وسنن سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

کس قدر عجیب بات ہے کہ اس بارے میں کہ مسجد سے کونسا پیر پہلے باہر نکالیں اور کونسا پہلے اندر رکھیں اور غسل کرتے وقت وضو پہلے کریں یا بعد میں، ایسے مسائل میں تو واقدی کی روایت معتبر نہ ہو کہ یہ احکام وسنن کا معاملہ ہے اور ایسا شخص جو باتفاق اہلسنت والجماعت حضراتِ شیخین کے بعد پوری امت میں سب سے افضل مانا جاتا ہو جس کو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشینِ ثالث ہونے کا شرف حاصل ہو جس کے لیے جنت کی بشارت ہو جس کو شہید کا خطاب دیا گیا ہو اُسکی عزت وعظمت اسکی ثقاہت ودیانت پر حملہ ہو اس کے بارے میں واقدی کی روایت معتبر مان لیجیے۔ کیا یہ صحیح ہے۔

بریں عقل ودانش بباید گریست

(۵) ایک اور عمل ملاحظہ ہو کہ الفاظ کے گورکھ دھندے میں ان خرابیوں کو نظر سے اوجھل کر دیا جو خود اس روایت کے اندر موجود ہیں جن کی بناء پر تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ یہ قول انہیں زہری کا ہوگا جو فنِ حدیث کے امام مانے جاتے ہیں۔ اس قول میں ہے "حضرت عثمان نے اپنی حکومت کے آخری چھ سالوں میں اپنے

رشتہ داروں اور خاندان کے لوگوں کو عہدے دیئے"۔

یہ کھلی غلط بیانی ہے۔ جن رشتہ داروں کے نام لیے جاتے ہیں اور جن عطیوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے وہ آخری چھ سالوں میں نہیں ہیں۔ بلکہ پہلے چھ سالوں میں ہیں۔ تمام تفصیل پہلے گذر چکی ہے، یہاں اس کا اعادہ طوالت ہے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ولید بن عقبہ، عبداللہ بن سعد بن ابی سرح، عبداللہ بن عامر (حاکم بصرہ) ان سب کے تقرّرات پہلے چھ سالوں میں ہو چکے ہیں فتح افریقہ اور افریقہ یا مصر کے خمس کا قصہ بھی پہلے چھ سالوں میں ہوا۔ ولید بن عقبہ کے بعد حضرت سعید بن العاص کے تقرر کے متعلق بھی یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ وہ آخری چھ سالوں میں ہوا۔ یہ تقرر خلافتِ عثمانی کے چھٹے سال کے آخر میں یا ساتویں کے شروع میں ہوا۔

بہر حال آخری چھ سالوں میں رشتہ داروں کے تقرر کا قول ایک ایسا غلط قول ہے جو اس زہری کا تو نہیں ہو سکتا جو فنِ حدیث کے امام مانے جاتے ہیں۔ یہ ایک ایسی علّت ہے کہ فنِ حدیث کے اصول کے لحاظ سے اس علّت کی بناء پر یہ قول معلول ہو گیا۔ معلول قول قابلِ اعتبار نہیں ہوتا۔

اس قول میں دوسری علّت (خرابی) یہ ہے کہ قول میں یہ ہے کہ مروان کیلیے مصر کا خمس لکھ دیا۔ جو سراسر غلط ہے۔ اگر خمس دینے کی روایت ہے بھی تو افریقہ کے مالِ غنیمت کی ہے، مصر کے خمس کی نہیں۔ مودودی صاحب نے اس بگاڑ کو درست کرنے کی کوشش کی اور "یعنی" کہہ کر غلط کو صحیح کرنا چاہا، مگر یہ کھلی ہوئی جنبہ داری ہے روایت میں خمس مصر ہے جو یقیناً غلط ہے۔ زہری رحمۃ اللہ علیہ ایسی غلط بات نہیں کہہ سکتے۔

تیسری علّت یہ ہے کہ حضرت عثمان کے متعلق کہا ہے کہ انہوں نے بیت المال سے روپیہ بھی لیا اور قرض رقمیں بھی لیں۔ یہ ایسی بات ہے جو کسی محدّث یا مورّخ نے نہیں کہی، خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی مشہور تقریر میں اس کی تردید کی ہے۔ (طبری ص ۱۰۳۔ ج ۵) اور جس کو پوری ملّت نے "غنی" کا خطاب دیا۔ درایۃً اسکی سیرت کے خلاف ہے۔ ایسی بات جو عام محدثین کی روایات اور اُن کے مسلّمات سے ہٹ کر کہی جائے اصولِ روایت کے لحاظ سے "شاذ" اور "منکر" کہلاتی ہے۔ شاذ اور منکر روایت ضعیف ہوتی ہے قابلِ استناد نہیں ہوتی۔

اسی طرح یہ علّت بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اقرباء کو خود اپنی دولت

تقسیم کی اس طرح کہ اپنے لڑکوں کو بھی دس ہزار ہی دیئے جو دوسروں کو ملے تھے۔ یہ ایک مستند اور مشہور روایت ہے سب ہی اسکو تسلیم کرتے ہیں۔ مودودی صاحب نے اس کو تسلیم کیا ہے۔ (خلافت وملوکیت ص ۳۲۱)
لہٰذا اس مشہور اور مسلّم کے خلاف اس قول میں جو کچھ کہا گیا ہے کہ بیت المال میں سے اپنا حق لیکر ورثاء میں تقسیم کیا۔ اصولِ روایت کے لحاظ سے شاذ و منکر اور ناقابلِ اعتبار ہے۔

مودودی صاحب نے الفاظ کے گورکھ دھندے میں روایت کی ان تمام کمزوریوں پر پردہ ڈال دیا۔ کیا اس کا نام دیانت ہے۔؟

(۶) مودودی صاحب کی چابکدستی ملاحظہ ہو۔ آپ تردید کو تائید فرمارہے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں:۔

> اس کی تائید ابن جریر طبری کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے کہ افریقہ میں عبداللہ بن سعد بن ابی سرح نے وہاں کے بطریق سے تین سو قنطار سونے پر مصالحت کی تھی (فامر بھا عثمان لآل الحکم) پھر حضرت عثمان نے یہ رقم الحکم یعنی مروان کے باپ حکم کے خاندان کو عطا کر دینے کا حکم دیا۔ (خلافت وملوکیت ص ۳۲۷)

اس بیان کے نقل کرنے میں مودودی صاحب نے کمال یہ کیا ہے کہ اس بیان کا آخری لفظ جس سے روایت کا بوگس اور متضاد ہونا ثابت ہو وہ نقل ہی نہیں کیا۔ قلت اولمروان قال لا ادری۔ (طبری ص ۵۰-ج ۵)
مطلب یہ ہے کہ یہ روایت ابنِ کعب نے بیان کی تھی۔ اسامہ بن زید لیثی راوی ہیں۔ راوی یعنی اسامہ بن زید لیثی نے ابن کعب سے دریافت کیا۔ "آل حکم" سے مراد کون ہیں۔ کیا مروان کو یہ رقم دی تھی۔ تو ابن کعب نے جواب دیا مجھے خبر نہیں۔

اب غور فرمائیے۔ افریقہ کے خمس کا معاملہ ہے۔ ابن کعب کہتے ہیں مجھے خبر نہیں کس کو یہ رقم دی۔ مشہور یہ ہے کہ افریقہ کا خمس مروان کو دیا گیا۔ اس بناء پر اسامہ بن زید بھی یہی فرماتے ہیں کہ کیا یہ رقم مروان کو دی۔ اگر ابن کعب کو معلوم نہیں کہ کس کو دی تو اسامہ بن زید کا قیاس صحیح ہوگا کہ مروان کو دی گئی۔ خود مودودی صاحب بھی یہی سمجھتے ہیں، اسی بناء پر بزعم خود اس کو تائید فرمارہے ہیں، لیکن اس صورت میں اس روایت سے تائید نہیں ہوتی۔ بلکہ تضاد اور اختلاف میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ کیونکہ جو روایتیں پیش کی گئی ہیں اب تک ان میں یہ اختلاف تھا کہ مروان کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پندرہ ہزار روپے دیئے یا خمس دیا۔ خمس دیا تو مصر کا یا افریقہ کا، یا افریقہ کا خمس مروان کے

ہاتھ پانچ لاکھ میں فروخت کر دیا تھا۔ وہ رقم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے معاف فرمادی۔ اب ایک اضافہ اور ہو گیا کہ یہ خمس نقد رقم تھی یا قابلِ فروخت سامان۔ اس روایت میں ہے کہ تین سو قنطار تھے۔ یعنی یہ خمس سونے کی شکل میں تھا اور تین سو قنطار تھا تو فروخت کرنے والی روایت کے بھی خلاف ہوا اور تعداد میں بھی اختلاف ہو گیا کہ پانچ لاکھ کے بجائے تین سو قنطار رہے۔ تین سو قنطار کتنا بھی ہوتا ہو پانچ لاکھ نہیں ہوتا۔

اب کوئی بھی انصاف پسند اس پوری روایت پر غور کریگا تو وہ اس کو "متضاد" قرار دے گا۔ یہ مودودی صاحب کی خوش فہمی ہے کہ وہ اس کو تائید فرمارہے ہیں۔ مزید برآں کمال یہ ہے کہ ابن جریر طبری نے اس کو ۲۷ھ کے واقعات میں نقل کیا ہے اور قرینِ قیاس بھی یہی ہے کہ اگر یہ انعام دیا گیا ہے تو ۲۷ھ میں یعنی خلافت کے نصف اوّل میں عطا فرمایا گیا ہوگا، کیونکہ افریقہ انہیں ایام میں فتح ہوا تھا، مگر ابن سعد کے مصنوعی زہری فرمارہے ہیں کہ ست اواخر یعنی نصف ثانی کے چھ برسوں میں انعامات دیئے اور بخششیں کیں۔

شد پریشاں خواب من از کثرتِ تعبیرہا

(۲) سیّدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قول۔

مودودی صاحب فرماتے ہیں:۔

حضرت عثمان نے خود بھی ایک موقع پر ایک مجلس میں جہاں حضرت علی حضرت سعد ابن ابی وقاص، حضرت زبیر، حضرت طلحہ اور حضرت معاویہ موجود تھے اور اُن کے مالی عطایا پر اعتراضات زیرِ بحث تھے اپنے طرزِ عمل کی تشریح فرمائی:

میرے دونوں پیش رو اپنی ذات اور اپنے رشتہ داروں کے معاملہ میں سختی برتتے رہے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو اپنے رشتہ داروں کو مال دیا کرتے تھے۔ میں ایک ایسے خاندان سے ہوں جسکے لوگ قلیل المعاش ہیں۔ میں نے اس خدمت کے بدلے میں جو میں اس حکومت کی کر رہا ہوں اس مال میں سے روپیہ لیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ مجھے ایسا کرنے کا حق ہے۔ اگر آپ لوگ اسے غلط سمجھتے ہیں تو اس روپیہ کو واپس کرنیکا فیصلہ کر دیجیے میں آپ کی بات مان لوں گا۔ سب لوگوں نے کہا آپ نے یہ بات بہت ٹھیک فرمائی۔ پھر حاضرین نے کہا آپنے عبداللہ بن خالد بن اُسید اور مروان کو روپیہ دیا ہے ان کا بیان تھا کہ یہ رقم مروان کو پندرہ ہزار کی اور ابن سعد کو ۵۰ ہزار کی مقدار۔ میں

دی گئی، چنانچہ یہ رقم ان دونوں سے بیت المال کو واپس دلوائی گئی اور لوگ راضی ہوکر مجلس سے اٹھے۔ (خلافت وملوکیت ص ۳۲۷، ۳۲۸)

اگر مودودی صاحب یا راوئ روایت ان رشتہ داروں میں سے کسی ایک دو کا نام لے دیتے تو ہم یہ کہنے کی جرأت نہ کرتے کہ یہ روایت اپنی تردید آپ کر رہی ہے۔ تاریخ اسلام سے معمولی واقفیت رکھنے والے بھی جانتے ہیں کہ حضرت[1] عثمان رضی اللہ عنہ خود دولت مند تھے اور آپ کا خاندان بھی دولتمند تھا۔ بنو ہاشم اور بنو امیہ کی امتیازی خصوصیات میں یہ کہا جاتا ہے کہ بنو ہاشم اتنے صاحب دولت نہیں تھے جتنے صاحب حوصلہ تھے۔ اور بنو امیہ کے پاس دولت تھی، مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جیسے مستثنیٰ افراد کے علاوہ عام طور پر بنو امیہ خرچ کرنے کے حوصلہ سے محروم تھے مثلاً حضرت ابوسفیان جو بنو امیہ ہی میں سے تھے ان کی بیوی نے (حضرت ہندہ رضؓ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی تھی کہ ابوسفیان بہت ہی ہاتھ روک کر خرچ کرتے ہیں۔ دوسری روایت میں ہے کہ بخیل (کنجوس[2]) آدمی ہیں۔

محترم مودودی صاحب نے مفہوم بیان کر دیا کہ۔ "میں ایسے خاندان سے ہوں جس کے لوگ قلیل المعاش ہیں۔" حالانکہ الفاظ یہ ہیں انا فی رھط اھل عیلۃٍ وقلۃ معاش (طبری ج ۵ ص ۱۰۱) یعنی صرف قلیل المعاش نہیں بلکہ یہ بھی کہ صاحبِ فقر وفاقہ ہیں۔ اھل عیلۃ (صاحب فقر وفاقہ) اور قلیل المعاش۔

اب اگر صاحب فقر وفاقہ اور قلیل المعاش حضرت مروان ہیں، کیونکہ بخشش کے سلسلہ میں انہیں کا نام لیا جاتا ہے تو تعجب ہوتا ہے کہ یہی راوی حضرات یہ بھی فرماتے ہیں کہ افریقہ کا خمس حضرت مروان نے پانچ لاکھ میں خرید لیا تھا (ابن خلدون وابن کثیر) تو یہ اہل عیلہ اور قلیل المعاش عجیب ہیں جو لاکھوں کی خرید و فروخت کرتے ہیں۔ اور فقیر و مسکین[3] بھی ہیں۔

---

[1] حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بنو امیہ میں مستثنیٰ تھے کہ آپ کی سخاوت کے چشمے ہمیشہ موجزن رہے۔ جیسے ابولہب بنو ہاشم میں مستثنیٰ تھا کہ سود خوار بھی تھا اور حریص بھی ایسا کہ خزانہ کعبہ سے سونے کا ہرن چرا کر بیچ ڈالا (معارف ابن قتیبہ) [2] ابوسفیان رجل سیک، بخاری ص ۸۰۷ رجل شحیح بخاری ص ۸۰۸) [3] کہا جاتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ پانچ لاکھ معاف فرما دیئے تھے۔ اگر بفرض محال اسکو صحیح مان لیا جائے تو معافی تو بعد میں ہوئی سوال تو یہ ہے کہ ایک فقیر و مسکین کو یہ ہمت کیسے ہوئی کہ پانچ لاکھ کا سودا کرے۔

دوسرے صاحب خالد بن اُسید۔ وہ اتنے قریبی رشتہ دار نہیں ہیں کہ اُن کو خاندان کا فرد کہا جا سکے۔ اس کے علاوہ وہ تمام روایتیں اس روایت کی تردید کرتی ہیں جن میں خمس افریقہ کے عطا کرنے یا پانچ لاکھ میں فروخت کرنے پھر قیمت کو معاف کر دینے کا افسانہ ہے (جو پہلے گذر چکا ہے) یہ تضاد اور اہمال مفہوم کے لحاظ سے ہے باقی رہا سند کا معاملہ تو وہ اس سے بھی زیادہ عجیب بلکہ مضحکہ خیز ہے۔ اس سند میں یکے بعد دیگرے پانچ راوی ہیں۔

(۱) عبداللہ بن احمد بن شبّویہ (۲) یہ عبداللہ اپنے والد احمد بن شبّویہ سے نقل کرتے ہیں (۳) احمد بن شبّویہ عبداللہ سے نقل کرتے ہیں۔ یہ تین بزرگ کون ہیں؟ بہت بہتر ہو اگر مودودی صاحب یا ان کے ہمنوا حضرات ان کا تعارف کرا دیں اگر وہ تعارف نہ کرا سکیں اور یقیناً نہیں کرا سکتے تو مجہول راویوں کی روایت کا مقام ردّی کی ٹوکری ہے۔ استدلال میں اس کو پیش کرنا استدلال کی توہین ہے۔

چوتھے راوی اسحاق بن یحییٰ ہیں۔ بسلسلہ اسماء الرجال ان کا تعارف کرایا گیا ہے، مگر اسی طرح یحییٰ بن سعید قطان فرماتے ہیں شبہ لا شئ ایک دھوکا ہیں۔ ان کی حقیقت کچھ نہیں ہے اور ابن معین فرماتے ہیں لا یکتب حدیثہ یہ اس قابل نہیں کہ ان کی حدیث لکھی جائے (میزان الاعتدال) بہرحال پہلے تین راوی اگر ان کا تعارف ہو جائے اور فرض کر لیجیے وہ سب ثقہ ثابت ہوں تو اسحاق بن یحییٰ کا واسطہ ایسا ہے جو انکی ثقاہت کو ختم کر دے گا اور سند کو لامحالہ لاشی بنا دے گا۔

پانچویں راوی موسیٰ بن طلحہ ہیں وہ بقول حافظ ذہبی رحمۃ اللہ ثقہ جلیل ہیں، مگر جب ان تک رسائی کے واسطے ضعیف، کمزور لاشئ اور بے حقیقت ہیں تو راوی اوّل کی ثقاہت اس لاشئ اور بے حقیقت کو قابلِ اعتماد نہیں بنا سکتی۔

تعجب ہوتا ہے مودودی صاحب اور ان کے ہمنوا حضرات سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر الزام لگانے کے لیے تو ایسی ضعیف بلکہ مضحکہ خیز روایتوں پر بھی اعتماد کرتے ہیں اور خود سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا بیان بھی تسلیم نہیں کرتے۔ ہم نہیں جانتے کہ یہ کونسا انصاف ہے کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے ارشاد کو تسلیم نہ کیا جائے جو آپ نے اہلِ مدینہ کے مجمع عام میں فرمایا تھا کہ۔

> میں نے جو کچھ دیا، اپنے پاس سے دیا میں مسلمانوں کے مال کو نہ اپنے لیے جائز سمجھتا ہوں نہ کسی بھی شخص کے لیے۔ (طبری ص ۱۰۳، ج ۵)

پری نہفتہ رخ و دیو بکرشمہ و ناز — بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

◆◆

حضرت مولانا مرزا اگل صاحب مدظلہ،
مدرس جامعہ مدنیہ لاہور

اسلامی نظامِ عدالت

(قسط اوّل)

وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ط (پ ۵)

اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا اَرٰىكَ اللّٰهُ ط (پ ۵)

جس طرح ظہورِ اسلام یعنی نزولِ قرآن اور بعثتِ رسول آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی زندگی کے تمام گوشوں کو بدل ڈالا، اسی طرح اس نے عہدِ جاہلیت کے نظامِ عدالت میں بھی مکمل انقلاب پیدا کر دیا۔ اسلامی نظامِ عدالت کو دنیا کی تمام عدالتوں پر تفوق و برتری حاصل ہے۔ دنیا کی غیر اسلامی عدالتیں تاریخ کے نامعلوم زمانہ سے انصاف کے گوہر آبدار کے حصول میں ناکام رہی ہیں، برعکس اس کے اسلام کا نظامِ عدالت اصلی معنوں میں انصاف کو بروئے کار لاتا ہے، وہ عدالتوں کی کثرت اور نمائش پر زور نہیں دیتا بلکہ عدل کی حقیقت پر اصرار کرتا ہے۔

"نظامِ عدالت" حکومت اسلامی کا ایک مستقل اور اہم شعبہ ہے۔ اسے شریعتِ اسلامی کی زبان میں صیغہ قضاء و جزاء بھی کہتے ہیں۔ یہ محکمہ خدا کے حکم کے مطابق قائم کیا جاتا ہے، کیونکہ قرآن حکیم کی رو سے حق تعالیٰ کی ذات ہی اقتدارِ اعلیٰ اور انصاف کا سرچشمہ ہے۔ اس کی مشیت یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ کی طرح اس شعبہ میں بھی اعتدال اور عدل برابر جاری رہے اور معمورۂ ارض سے حقیقی معنوں میں ظلم و زیادتی کا خاتمہ ہو جائے اور اس کے تمام بندے صحیح طور پر عدل و انصاف حاصل کر سکیں۔ لتحکم بین الناس بما انزل اللہ الیک۔

دورِ جاہلیت کا نظام | عہدِ جاہلیت میں بلحاظ نوعیت عدالت کی تین قسمیں تھیں۔ (۱) حکومت (۲) ثالثی (۳) داد خواہی۔ اس زمانہ میں بنی ہاشم کی حکومت تھی، یہ حکومت کس قسم کی تھی، تاریخ اس کے متعلق یقینی طور پر کچھ نہیں بتا سکتی، لیکن اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اسلام سے قبل عربوں کا معمول تھا کہ ان کے متمدن

قبائل معاشرہ اور سوسائٹی کی تنظیم اور فلاح کے لیے اجتماعی معاملات کی ذمہ داریاں آپس میں تقسیم کرلیا کرتے تھے، اس لیے یہ ممکن ہوسکتا ہے کہ بنی ہاشم کی اس حکومت کا مقصد ملک میں عدل وانصاف کا قیام ہو، قریش اور دیگر قبائل کے وفود ان کے پاس بغرض حصولِ انصاف آتے ہوں۔ عہدِ جاہلیت کے ممتاز قاضی جن کا ذکر تاریخ میں محفوظ ہے، ان میں ہاشم بن عبد مناف، ابولہب بن عبدالمطلب، عاص بن وائل، امیہ بن ابی الصلت، زہیر بن ابی سلمی، قیس بن ساعدہ ایادی بہت مشہور ہیں۔

یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ اس زمانہ میں خصومات کا خاتمہ صرف جج صاحبان کے فیصلہ سے ہی نہیں ہوجایا کرتا تھا۔ بلکہ ان فیصلوں کی تعمیل، طاقت اور قوت سے بھی کرائی جاتی تھی۔ جیسا تاریخ دورِ جاہلیت سے بھی اس کا پتہ چلتا ہے۔

اسلام کا ابتدائی دور اسلام کے ابتدائی دور میں چونکہ اسلام کا دائرہ اثر محدود تھا، اس لیے عدالت کے فرائض حضور سرورِ کائناتؐ خود انجام دیا کرتے تھے۔ آپ صرف مسلمانوں کے نہیں بلکہ غیر مسلموں کے خصومات کے بھی فیصلے فرمایا کرتے تھے۔ حضور سرورِ کائنات نہ صرف شریعتِ اسلامی کے مبلغ تھے، بلکہ ایک قاضی جج اور منصف کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ اس زمانہ میں پوری فطری سادگی موجود تھی اور اسلام کا دائرۂ اقتدار ایک مختصر رقبہ تک محدود تھا۔ خصومات اور مقدمات کی بھی کمی تھی۔ اس لیے اور قاضیوں اور ججوں کے تقرر کی ضرورت نہ تھی۔ لہٰذا ابتدائی دور میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے کسی شہر میں قاضیوں یا ججوں کا تقرر نہ فرمایا تھا۔ البتہ بعض علاقوں کے گورنر اس فرض کو بھی انجام دیتے تھے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ حضور علیہ السلام بعض خصومات ونزاعات کے طے کرانے کے لیے خاص عدالت مقرر کر دیا کرتے تھے۔ حضور علیہ السلام تمام نزاعات کا فیصلہ احکام وحی کے مطابق فرماتے تھے۔ آپؐ مدعی اور مدعا علیہ کے بیانات کو پورے غور سے سماعت فرماتے، آپؐ کے نزدیک ثبوت پیش کرنا مدعی کا فرض تھا۔ مدعا علیہ پر صفائی اور قسم لازم تھی۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان صورتوں میں سے کسی صورت سے صحیح واقعہ کا علم ہوجاتا تھا تو آپ فیصلہ فرما دیتے، آپ فرمایا کرتے تھے، میں ظاہری شواہد وثبوت سے فیصلے کرنے کے لیے مامور ہوں۔ بھیدوں سے صرف خدا کی ذات واقف ہے۔

اسلامی عدالت کا ایک اہم فقہی مسئلہ اسلامی نظام کی رو سے قاضی پر بموجب اس حدیث کے "البینۃ للمدعی والیمین علیٰ من انکر" یہ فریضہ عاید ہوتا ہے کہ سماعتِ بیانات کے بعد یہ بات معلوم

کرے کہ متخاصمین میں سے کونسا فریق مدعی ہے اور کونسا مدعا علیہ، کیونکہ ہر ایک فریق کا فریضہ دوسرے فریق کے فریضہ سے مختلف ہے۔ مدعی کا فریضہ ہے، گواہ پیش کرنا اور بصورتِ عدم شہادت مدعا علیہ کا فریضہ ہے قسم وحلف اٹھانا۔ بشرطیکہ مدعی مطالبہ کرے۔ لہٰذا بذمہ قاضی یہ بات لازم ہے کہ سماعت کے بعد مدعی اور مدعا علیہ کا تعین کرے۔

مدعی اور مدعا علیہ کے متعلق فقہاء کی تعریفات مختلف ہیں۔ بعض فقہاء فرق یہ بیان کرتے ہیں کہ مدعی وہ ہے جو خصومت پر مجبور نہ ہو۔ یعنی اگر وہ خصومۃ چھوڑتا ہے تو کوئی بھی اس کو مجبور نہیں کر سکتا۔ مدعا علیہ وُہ ہے جو خصومۃ پر مجبور ہوتا ہے۔ اس کو مجبوراً عدالت میں پیش ہونا پڑتا ہے۔

بعض فقہاء یہ فرق بیان کرتے ہیں کہ مدعی وہ ہے کہ ثبوتِ حق میں محتاجِ دلیل ہو۔ جب تک اس کے پاس کوئی گواہ اور شاہد موجود نہ ہو، اس کا حق اور دعویٰ ثابت نہیں ہے جیسے "خارج" مدعا علیہ وہ ہے جو محتاجِ دلیل نہیں ہے۔ بلکہ صرف اس کا قول اور قبضہ کافی ہو۔ جیسے "ذوالید اور قابض"۔

مخاصمات کے چند اصطلاحی الفاظ ہر مخاصمت اور نزاع میں چند الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ مدعی، مدعا علیہ، مدعا یا مدعا بہ، دعویٰ۔

مثال: "زید نے عمرو پر مال کا دعویٰ کیا"۔ اس میں "زید" مدعی ہے۔ "عمرو" مدعا علیہ ہے۔ "مال" مدعا یا مدعا بہ ہے۔ اور "زید کا عمرو سے مطالبہ کرنا" دعویٰ ہے۔

چونکہ اکثر قاضی کی عدالت میں اول مدعی دعویٰ پیش کرتا ہے۔ اس کے بعد قاضی مدعا علیہ کو طلب کرتا ہے۔ لہٰذا سماعتِ دعویٰ کے وقت اور بیان مدعی کے وقت قاضی کو چاہیئے کہ مدعی کا بیان غور سے سنے۔ اگر مدعی کا بیان درست ہے۔ اس میں کوئی تعارض اور تضاد نہیں ہے اور وہ عرفاً، عادتاً اور عقلاً متعذر اور ممتنع بھی نہیں ہے تو مدعا علیہ کو طلب کرے۔ بعض فقہاء کا یہ بھی قول ہے کہ اگر قاضی کی عدالت میں اور مدعا علیہ کے مقامِ سکونت میں مسافتِ بعیدہ ہو اور آنے جانے میں دقّت پیش آتی ہو تو قاضی کو چاہیئے کہ مدعی سے اس کے اپنے بیان پر حلف بھی لے۔ تب مدعا علیہ کو طلب کرے، کیونکہ بسا اوقات مدعی خلافِ حق دعویٰ کے لیے جھوٹے گواہ تیار کر لیتا ہے، لیکن خود اس دعویٰ پر قسم کے لیے تیار نہیں ہوتا اور فقہاء یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر مدعی اپنے دعویٰ پر حلف کے لیے تیار نہیں ہے تو قاضی کو چاہیئے کہ ایسے مدعی کے گواہوں کی شہادت بھی منظور نہ کرے۔

مدعی اور مدعا علیہ میں مساوات | حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم بوقتِ سماعت بیان کسی کی رعایت نہیں فرماتے تھے اور ہمیشہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تاکید فرمایا کرتے تھے کہ کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے مدعی اور مدعا علیہ کی باتیں پورے طور پر سنو، کیونکہ فریقین کی باتیں سننے کے بعد حقیقتِ حال سامنے آجائے گی۔ قاضیٔ عدالت کو چاہیئے کہ متخاصمین میں مساوات ملحوظ رکھے۔ "جلوس" اور "توجہ" میں کسی کا لحاظ نہ کرے کیونکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے۔ "اذا ابتلی احدکم بالقضاء فلیسو بینہم فی المجلس والاشارۃ والنظر"۔ اوکما قال علیہ الصلوٰۃ والسلام لہٰذا ایامِ مخاصمت میں قاضی فریقین میں سے کسی کی ضیافت بھی قبول نہیں کرسکتا اور کسی کے ساتھ سرگوشی بھی نہیں کرسکتا اور نہ کوئی ایسا کلام یا اشارہ کرسکتا ہے جس سے فریقِ ثانی کی دل شکنی ہو۔

متخاصمین کو بوقتِ بیانات قاضی کے روبرو بفاصلہ دوگز شرعی بیٹھنا چاہیئے۔ چاہے ایک امیر اور دوسرا فقیر ہی کیوں نہ ہو۔ قاضی کی عدالت میں "صاحب المجلس" بھی ہونا چاہیئے جو خلافِ آدابِ امور سے لوگوں کو منع کرے۔ قاضی کی عدالت میں بلاضرورت بلند آواز سے بولنا بھی خلافِ آدابِ عدالت ہے اور بلا ضرورت ازدحام اور انبوہ بھی خلافِ آدابِ عدالت ہے، قاضی کو کمرۂ عدالت میں ایسا کلام یا اشارہ بھی نہیں کرنا چاہیئے جس سے گواہوں کو شہادت میں مدد مل سکتی ہو۔ البتہ اس مسئلہ میں قاضی ابویوسفؒ کا مسلک یہ ہے کہ اگر قاضی کمرۂ عدالت میں کوئی ایسا اشارہ یا تلقین کرتا ہے جس سے گواہوں کو شہادت میں مدد ملتی ہو بشرطیکہ مقام تہمت اور الزام نہ ہو تو اس میں مضائقہ نہیں ہے، کیونکہ بسا اوقات بسببِ عدمِ اُلفت اور عدمِ واقفیت گواہ پر عدالت کی دہشت پڑجاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ شہادت دینے سے بھی قاصر رہ جاتا ہے۔ لہٰذا قاضی ابویوسفؒ کے مسلک میں "ایصال حق الیٰ صاحب الحق" میں کوئی حرج نہیں ہے۔

قاضی کا شرعی فیصلہ | یہ بات بھی ملحوظ رہنی چاہیئے کہ سماعتِ بیانات کے بعد مدعی کے ذمہ گواہ پیش کرنا ہے۔ اگر مدعی نے دعویٰ کے مطابق شہادت پیش کی تو قاضی فیصلہ بحقِ مدعی کرے گا اور اگر مدعی کے پاس ثبوتِ دعویٰ کے لیے گواہ تو نہیں ہیں، لیکن مدعا علیہ خود مدعی کا دعویٰ تسلیم کرتا ہے (جس کا نام اقرار ہے) تب بھی فیصلہ بحقِ مدعی ہوگا اور اگر مدعی کے پاس ثبوتِ دعویٰ کے لیے گواہ بھی نہیں اور مدعا علیہ بھی تسلیم دعویٰ سے انکار کرتا ہے تو اس صورت میں اگر مدعی مدعا علیہ سے حلف لینا چاہے تو مدعا علیہ کو قسم اٹھانا پڑیگی۔ اگر مدعا علیہ نے قسم اٹھالی تو مدعی کا حق ساقط ہے اور مدعا علیہ بری الذمہ ہے۔ لہٰذا اس صورت میں فیصلہ بحقِ مدعا علیہ ہوگا

اگر مدعی کے پاس ثبوتِ دعویٰ کے لیے شہادت موجود ہے اور نہ مدعا علیہ تسلیم و اقرار کرتا ہے اور نہ ہی مدعا علیہ باوجود مطالبہ مدعی کے قسم اور حلف اٹھاتا ہے، بلکہ مدعی کے دعویٰ سے بھی انکار کرتا ہے اور قسم اٹھانے سے بھی، جسے اصطلاحِ فقہاء میں نکول کہا جاتا ہے تو اس صورت میں بھی فیصلہ حقِ مدعی ہوگا اور مدعی کا حق بذمہ مدعا علیہ لازم ہوگا۔

قاضی کا فیصلہ مذکورہ بالا صورتوں میں ہی منحصر ہے۔ سماعتِ بیانات کے بعد قاضی متخاصمین کے درمیان جبراً صلح نہیں کرا سکتا، ہاں اگر متخاصمین خود صلح پر رضامند ہوں تو کوئی حرج نہیں ہے۔

اسلامی نظامِ عدالت کے قانون میں قاضی اپنے ذاتی علم اور معلومات سے فریقین کے درمیان فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اگرچہ اس کو یہ معلوم بھی ہو کہ حق کس کی جانب ہے۔ البتہ اپنی ذاتی معرفت اور علم کو بطورِ جرح اور اعتراضات کے استعمال کر سکتا ہے۔ قاضی کو صرف ظاہری شواہد اور دلائل کے مطابق فیصلہ دینا ہوگا۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال والعباد مکلفون بظاھر الاحوال۔

آنحضرتؐ کے دور میں قاضیوں اور مفتیوں کا تقرر | اسلام کے اثر و نفوذ کا دامن جب زیادہ وسیع ہو گیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہؓ کو مقرر فرمایا تاکہ وہ قرآن و حدیث کی روشنی میں لوگوں کے معاملات کا تصفیہ کیا کریں۔ اور جب اجتہاد کی ضرورت ہو تو اجتہاد سے کام لیں۔ جیسا کہ معاذ بن جبلؓ کو جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تو یہی نصیحت فرمائی تھی۔

اس دور کے مشہور مفتی مندرجہ ذیل حضرات ہیں۔

خلفاءِ اربعہؓ، عبدالرحمٰن بن عوفؓ، ابی بن کعبؓ، عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، معاذ بن جبلؓ، عمار بن یاسرؓ، حذیفہ بن الیمانؓ، زید بن ثابتؓ، سلمان فارسیؓ، ابوالدرداءؓ، ابوموسیٰ الاشعریؓ۔ ان کے علاوہ ازواجِ مطہرات بھی فتویٰ دیا کرتی تھیں۔

مدینہ منوّرہ میں طبقہ تابعین کے مشہور مفتی یہ تھے، سعید بن المسیب، ابوبکر بن عبدالرحمٰن، قاسم بن محمد، عروہ، سلیمان، خارجہ۔

آدابُ القاضی واقسامہ | اسلامی نظامِ عدالت کے اعتبار سے نہ ہر شخص قاضی بن سکتا ہے اور نہ شاہد بن سکتا ہے۔ جب تک کسی شخص میں یہ چار صفات موجود نہ ہوں۔ بلوغ، عقل، اسلام، عدالت۔

اصطلاحِ فقہاء میں "عدالت" کا ترجمہ ہے کبائر سے اجتناب کرنا اور صغائر پر اصرار نہ کرنا۔ باقی تین شروط اتفاقی ہیں جن کے بغیر کوئی شخص بھی قاضی اور شاہد نہیں بن سکتا۔ لہٰذا مسلمان کے حق میں غیر مسلم کی نہ

شہادت قابلِ اعتبار ہے اور نہ قضاء؛ البتہ شرطِ عدالت میں فقہاء مختلف ہیں کہ آیا فاسق بھی قاضی بن سکتا ہے یا نہیں، احناف کے مسلک میں فاسق قاضی بھی بن سکتا ہے، اور شاہد بھی۔ اگر فاسق قاضی فیصلہ کرے گا تو نافذ ہوگا۔ اگر فاسق شہادت دیتا ہے تو قابلِ قبول ہے اور اس شہادت کے مطابق قاضی فیصلہ دے سکتا ہے، لیکن قاضی گنہگار ہوگا۔ ایسا ہی امیرِ مملکۃ کو چاہیئے کہ کسی فاسق شخص کو قاضی نہ بنائے، ورنہ وہ بھی گنہگار ہو گا، کیونکہ جناب رسولِ کریم کا فرمان ہے۔

من تولّٰی من امر المسلمین شیئًا فاستعمل علیہم رجلا وھو یعلم ان فیھم من ھو اولیٰ بذالك واعلم منہ بکتاب اللہ وبسنۃ رسولہ (صلی اللہ علیہ وسلم) فقد خان اللہ و رسولہ وجماعۃ المسلمین۔ اوکما قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

یعنی جو شخص مسلمانوں کے کسی معاملے کا والی بنا پس اس نے ان پر کسی آدمی کو عامل بنایا۔ حالانکہ وہ جانتا ہے کہ مسلمانوں میں ایسا شخص موجود ہے جو اس عہدہ کے لیے اس سے زیادہ موزوں اور بہتر ہے۔ کتاب اللہ اور سنّت رسول کا (بھی) اس کی بہ نسبت زیادہ جاننے والا ہے تو اس (والی) نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت کی۔

البتہ عورت نہ تو حدود و قصاص میں کوئی فیصلہ دے سکتی ہے اور نہ ہی شہادت دے سکتی ہے۔ قاضی کو چاہیئے کہ اگر وہ مقلد ہے تو اپنے مذہب کے ائمہ کے اکثر اقوال سے واقف ہو۔ ایسے ہی قاضی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ قوم کی عادات، اصطلاحات اور محاورات سے بھی پورا واقف ہو، کیونکہ بسا اوقات قاضی کو عرف کے مطابق فیصلہ دینا ہوتا ہے۔

قاضی کا فیصلہ اگر منصوص حکم یا اجماعی مسائل کے خلاف ہو تو قابلِ قبول نہ ہوگا۔ لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق۔ اگر قاضی مقلد ہے اور اپنے مذہب کے خلاف فیصلہ دیتا ہے تو مفتی بہ یہ ہے کہ یہ فیصلہ بھی قابلِ اعتبار نہیں ہے۔ چاہے قصداً ہو، چاہے سہواً۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم القضاۃ ثلاثۃ اثنان فی النار وواحد فی الجنۃ، رجل عرف الحق فقضیٰ بہ فھو فی الجنۃ ورجل عرف الحق فلم یقض بہ وجار فی الحکم فھو فی النار ورجل لم یعرف الحق فقضیٰ للناس علیٰ جھل فھو فی النار۔

(یعنی) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قاضی تین طرح کے ہوتے ہیں، دو جہنمی اور ایک جنتی، ایک وہ کہ جس نے حق کو پہچانا اور اس کے مطابق فیصلہ کیا پس وہ جنت میں ہے۔ وہ کہ جس نے حق کو پہچانا اور فیصلہ اس کے مطابق نہ کیا اور فیصلہ کرنے میں تعدی کی پس وہ جہنم میں ہے وہ جس نے حق کو نہیں پہچانا۔ اور جہالت ہی پر لوگوں کا فیصلہ کیا وہ بھی جہنم میں ہے۔

قضاء کے متعلق علماء کا مسلک یہ ہے کہ بعض اوقات عہدۂ قضاء قبول کرنا فرض عین ہوتا ہے اور بعض اوقات فرض کفایہ۔ اگر کسی وقت کسی علاقہ یا کسی شہر میں ایک شخص عہدۂ قضاء کے لیے موزوں ہے اور صرف وہی شخص اس عہدہ کا حق ادا کر سکتا ہے تو اس صورت میں اس شخص کے لیے عہدۂ قضاء قبول کرنا فرض عین ہوگا، کیونکہ رفعِ ظلم اور ایصالِ حق الیٰ اہلہٖ فرض ہے اور اس کے لیے اس کے سوا کوئی دوسرا شخص اہل نہیں ہے۔ اس صورت میں امیر اور حاکمِ وقت اس شخص پر جبر بھی کر سکتا ہے۔ اگر اس حالت میں کوئی نااہل عہدۂ قضاء پر قابض ہو جائے اور یہ چپ چاپ بیٹھ جائے تو یہ یقیناً گنہگار ہوگا۔ اگر اس کی موجودگی میں حاکم وقت نے کسی نااہل کا انتخاب کیا تو حاکم بھی گنہگار ہوگا اور قوم بھی۔ فقد خان اللہ ورسولہ۔ اور یہی حکم خطباً اور ائمہ کا بھی ہے کہ قابل کی موجودگی میں غیرِ قابل ان عہدوں کا حقدار نہیں ہے۔ البتہ اگر ایک وقت میں اس عہدہ کے لیے اہل اور قابل اشخاص بکثرت موجود ہوں تو اس صورت میں اس عہدہ کو قبول کرنا فرض عین نہیں بلکہ فرض کفایہ ہے۔ اگر ایک شخص بھی اس فریضہ کو ادا کر دیتا ہے تو باقی بری الذمہ ہو جائیں گے اور یہی وجہ ہے کہ امام اعظمؒ نے عہدۂ قضاء سے اجتناب کیا۔ وقال البحر عمیق فکیف اعبرہ بالسباحۃ فقال ابو یوسفؒ البحر عمیق والسفینۃ وثیق والملاح علیم فقال ابو حنیفہؒ کانی بک قاضیا۔

علامہ شامی نے لکھا ہے القاضی النافذ حکمہ اعز من الکبریت الاحمر (وہ قاضی جس کا حکم بقانونِ شرع نافذ ہو کبریتِ احمر سے زیادہ نایاب ہے) یعنی کبریتِ احمر (سُرخ گندھک) تو مل سکتی ہے لیکن قاضیٔ شرعی کا ملنا مشکل ہے۔ یہ اس لیے کہ قاضی شرعی وہ قاضی ہے جو اجتہاد اور استنباطِ مسائل کی قوت رکھتا ہو (اور یہی امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور احمد بن حنبلؒ کا مسلک ہے اور احناف کی نادر الروایت بھی یہی ہے کہ قاضی مجتہد ہونا چاہیئے اگرچہ مفتی بہ مسلک یہ نہیں ہے۔)

ایسا قاضی جو عہدۂ قضاء کا حصول ناجائز طریقہ پر نہ کرتا ہو۔ (یعنی رشوتوں اور سفارشوں سے عہدہ حاصل

کرنے کی کوشش نہ کرتا ہو) اور جس مذہب کا وہ پابند ہو، اس مذہب کے ائمہ مجتہدین کے سب اقوال و روایات پر اسے عبور حاصل ہو اور فصلِ خصومات میں تحفہ تحائف اور رشوتوں سے اجتناب کرتا ہو، ایسے قاضی کا وجود واقعی نہایت نایاب ہے۔

حاکم کو چاہیئے کہ خود عہدے کا مطالبہ نہ کرے، کیونکہ جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ جو شخص خود کسی عہدے کا مطالبہ کرتا ہے اللہ کی طرف سے اس کی مدد نہیں ہوتی، کیونکہ یہ اپنے نفس پر بھروسہ کرتا ہے اور جس شخص کو بغیر اُس کے مطالبہ کے قاضی بنا دیا جاتا ہے تو اللہ کی طرف سے اُس کی مدد ہوتی ہے۔

جس قاضی یا حاکم نے رشوت دے کر عہدہ حاصل کیا ہو وہ شرعی قانون کے بموجب شرعی قاضی اور حاکم نہیں ہوگا اور اگر سفارشوں سے عہدہ حاصل کیا ہو تو یہ قاضی اور حاکم تو ہوگا، لیکن یہ طریقہ (کہ سفارش سے عہدہ حاصل کرنے) اچھا اور مناسب ہرگز نہیں ہے۔

اگر کوئی قاضی ابتداء میں عادل تھا، لیکن قاضی بننے کے بعد رشوت لینے سے یا کسی اور عمل سے وہ فاسق بن گیا تو بعض علماء کا مسلک یہ ہے کہ وہ اس عمل سے خود بخود معزول ہو جاتا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ خود بخود معزول تو نہیں ہوتا، لیکن واجب العزل ہے۔

قاضی یا حاکم کے لیے کسی حالت میں رشوت لینی جائز نہیں ہے۔ ارشادِ رسول ہے الراشی والمرتشی کلاھما فی النار۔ ایک روایت میں ہے۔ الراشی والمرتشی والرائش کلھم فی النار۔

بہر حال صاحبِ عہدہ کے لیے کسی بھی حالت میں رشوت لینی جائز نہیں۔ چاہے رشوت لے کر حق فیصلہ کرے چاہے باطل فیصلہ کرے۔ اگر رشوت لے کر ناحق اور باطل فیصلہ کرتا ہے تو اس کا بطلان تو ظاہر ہے کہ ناحق فیصلہ کرنا اور رشوت لینی دونوں ناجائز ہیں۔ اگر حق فیصلہ کرتا ہے تو بھی رشوت لینی ناجائز ہے، کیونکہ حق فیصلہ کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے اور واجب کے بدلہ میں اجرت لینی ناجائز ہے۔ بہر حال رشوت دینی بھی ناجائز فعل ہے اور لینی بھی، البتہ اگر کسی شخص کا کوئی اپنا حق مال یا جان یا ناموس خطرے میں ہے اور رشوت کے علاوہ بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہ آئے تو اپنے حق کو بچانے کے لیے یہ شخص رشوت دے سکتا ہے۔ اس صورت میں وہ گنہگار نہیں ہوگا۔ پیغمبر خدا کا ارشاد ہے۔ من قتل دون نفسہ فھو شھید ومن قتل دون مالہ فھو شھید ومن قتل دون عرضہ فھو شھید۔

توجب جان ومال اور ناموس کی حفاظت میں جان دے سکتا ہے تو مال بطریقۂ اولیٰ دے سکتا ہے۔

اگر کوئی قاضی یا حاکم فرائضِ منصبی کے سوا کسی قسم کی دوسری محنت ومشقت کسی شخص کے لیے سرانجام دیتا ہے تو وہ اس محنت ومشقت کی اجرت لے سکتا ہے۔ یہ رشوت میں داخل نہیں۔

محکمۂ افتاء اسلامی نظامِ عدالت کا ایک اہم شعبہ "افتاء" ہے جسے آغازِ اسلام ہی میں قائم کر دیا گیا تھا۔ اس کی مثال سوائے اسلام کے اور کسی مذہب میں نہیں پائی جاتی۔ قانون کے مقدم اصولوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہر شخص کو قانون سے واقف ہونا چاہیئے۔

اگر کوئی شخص کسی جرم کا مرتکب ہو تو اس کا یہ عذر قابلِ سماعت نہیں ہے کہ وہ قانون سے بے خبر تھا۔ یہ قاعدہ اب تمام دنیا میں مسلم ہے اور موجودہ دَور کے ترقی یافتہ ممالک اور تعلیم یافتہ اقوام نے اس پر پُورا زور دیا ہے کہ جہالت عن القانون، مرتکبِ جرم کے لیے کوئی عذر نہیں ہے۔

یورپ میں باوجود تعلیم عام ہونے کے ہر شخص قانون دان نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی جاہل آدمی کسی قانونی نقطہ سے واقف ہونا چاہے تو اس کے لیے کوئی ایسی تدبیر موجود نہیں، لیکن اسلام نے اس کام کے لیے ایک خاص محکمہ قائم کر رکھا تھا جس کا نام محکمۂ افتاء تھا۔ اس محکمہ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہر شخص قانونی مسائل اور دقائقِ مسائل سے بآسانی اس محکمہ سے استفادہ کر سکتا ہے۔ بلکہ محکمۂ "قضاء" بھی دقیق مسائل میں اس محکمہ سے مدد لے سکتا ہے۔ اس محکمہ میں بڑے بڑے قابلِ فقہاء یعنی قانون دان رکھے جاتے تھے۔ اس محکمہ سے متعلقہ تمام افسران کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ عوام کو قانون بتائیں۔ اس صورت میں ہر شخص قانونی مسائل سے بآسانی واقف ہو سکتا تھا۔

مفتی قال النبی الکریم صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ لا یقبض العلم انتزاعاً بل یقبض العلم بقبض العلماء حتی اتخذ الناس رؤسا جہالا فافتوا بغیر علم فضلوا واضلوا۔ (رواہ البخاری)

"قاضی" کے متعلق فقہاء کے درمیان جو اختلاف ہے۔ وہی اختلاف مفتی کے متعلق بھی ہے۔ اول اختلاف یہ ہے کہ آیا مفتی کا مجتہد ہونا ضروری ہے یا نہیں؟ باقی ائمہ کا تو یہاں بھی مسلک یہ ہے کہ غیر مجتہد مفتی نہیں بن سکتا، لیکن احناف کے مسلک میں مقلد مفتی بن سکتا ہے۔

ایک اختلاف یہ ہے کہ فاسق مفتی بن سکتا ہے یا نہیں؟ احناف کا مفتی بہ مسلک یہ ہے کہ غیر عادل بھی مفتی بن سکتا ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ باوجود اس کے کہ وہ پکے شافعی ہیں۔ "قاضی" اور "مفتی" میں شرطِ اجتہاد وعدالت کے قائل نہیں ہیں۔ فرماتے ہیں کہ تغیرِ زمانہ کو تغیرِ احکام میں دخل ہے۔ اگر اب بھی قید

اجتہاد والعدالۃ قاضی اور مفتی کے لیے شرط قرار دے دی جائے تو "قضاء" اور "افتاء" کا دروازہ بند ہو جائے گا۔ کیونکہ ان اوصاف کا حامل قاضی اور مفتی کا ہر دَور میں ملنا مشکل ہے۔ البتہ آجکل قاضی و مفتی کے لیے کچھ علوم و اصول نہایت ضروری ہیں۔ مفتی کو چاہیئے کہ اوّل اپنے مذہب کے فقہاء کے طبقات معلوم کرے۔ جیسے مجتہد کے لیے قیاس کی اجازت اس وقت ہوگی کہ درپیش مسئلہ میں کوئی نص آیۃ یا حدیث اور اجماع موجود نہ ہو۔ اگر کسی مسئلہ میں نص موجود ہو تو مجتہد اس مسئلہ میں قیاس و اجتہاد نہیں کر سکتا۔ اسی طرح ہر مفتی کے لیے علم طبقات الفقہاء ضروری ہے، کیونکہ اگر کسی مسئلہ میں مختلف طبقات کے علماء کی رائیں مختلف ہیں تو طبقۂ عالیہ کی رائے کے مطابق عمل کیا جائے گا۔ اور اس کے مقابلہ میں طبقۂ سافلہ کی رائے قابلِ اعتبار نہ ہوگی۔ اگر کسی مسئلہ میں ایک طبقہ کے علماء مختلف ہیں تو وہاں مفتی کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ ان میں زیادہ فقیہ کون ہے۔ اگر فقاہت میں برابر ہیں تو مفتی کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ کس کا مسلک اوفق بالحال اور ارفق بالناس ہے۔

دوسرا مسئلہ مذاہب اور کتب کے متعلق ہے۔ ہر مفتی کو اپنے علماء کا مذہب صحیح طریقہ پر معلوم ہونا چاہیئے اور اپنے مذہب کی صحیح کتب کا بھی پتہ ہونا چاہیئے، کیونکہ ہر کتاب باعتبار فتویٰ قابلِ اعتبار نہیں ہے۔ ایسے ہی روایاتِ فقہاء و مسائل مدوّنہ کا بھی علم ضروری ہے۔ جب تک مفتی کو اشیاء مذکورہ کا علم نہ ہو وہ صحیح فتویٰ نہیں دے سکتا۔ یہ نہیں کہ جو کتاب ہاتھ لگی، اٹھائی اور دیکھی اور فتویٰ لکھ دیا، چنانچہ حنفی مذہب میں بکثرت ایسی کتب موجود ہیں کہ حقیقت میں باعتبار فتویٰ قابل اعتبار نہیں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ دنیا میں ہر مذہب میں بکثرت اختلافات موجود ہیں۔

جیسے حضرتِ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں "فتویٰ" کے لیے کچھ اصول مقرر فرمائے تھے اور یہ پابندی لگائی تھی کہ خلافت کی طرف سے مقرر شدہ مفتیوں کے علاوہ کوئی فتویٰ دینے کا مجاز نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فاروق اعظمؓ کے دورِ خلافت میں مذہبی فتنے اور اختلافات بہت کم تھے۔ آج بھی اگر اسلامی حکومت قائم ہو جائے اور فتویٰ دینے کے لیے کچھ اصول مقرر کر دیئے جائیں اور صحیح کتب و روایات مہیا کر دی جائیں جیسے امام محمدؒ کی ظاہر الروایۃ کی چھ کتابیں ہیں جو فی الحقیقت فقہ حنفی کی بنیادی کتابیں ہیں ایسے ہی کتاب المنتقی والکافی للحاکم الشہید محمد بن محمد (المتوفی ۳۳۴ھ) ظاہر الروایۃ کے بعد حنفی فقہ میں ان کتب کا درجہ ہے۔ اسی طرح کتاب الکافی والوافی لعبداللہ ابوالبرکات حافظ الدین النسفی (المتوفی ۷۱۰ھ۔ یہ صاحبِ تمیز سے ہیں) فقہ حنفی کی معتبر کتاب ہے۔

◆◆

الشفاء بتعریف حقوقِ المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

مولفہ: قاضی ابو الفضل عیاض بن موسیٰ الاندلسی
مترجمہ: محترم نور محمد صاحب غفاری ایم اے، بہاولنگر

الباب الاوّل

فی ثناء اللہ تعالیٰ علیہ واظہارہ عظیم قدرہ لدیہ

چوتھی فصل

اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عُلوِّ شان کی وجہ سے جو قسمیں کھائی ہیں ان کے بارے میں

آپ کی عمر کی قسم | لعمرك انهم لفی سکرتهم یعمهون ۔ تیری عمر کی قسم! وہ تو اپنی مستی میں سرگرداں ہیں (یہ آیۃ قوم لوطؑ کے بارے میں ہے) تمام مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے (عربوں کے محاورہ کے مطابق) جناب صلی اللہ علیہ وسلم کی مدتِ عمر کی قسم کھائی ہے۔

اختلافِ قرأت | "عَمْرُكَ" دراصل عُمُرُكَ تھا (یعنی میم کا پیش تھا) لیکن کثرتِ استعمال کی وجہ سے اسے بالکسر (یعنی میم کی زیر کے ساتھ) پڑھا جاتا ہے۔ اگر اس لفظ کو عُمُرُكَ پڑھا جائے تو پھر معنی ہوتے ہیں تیری بقا کی قسم! اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم! یہ لوگ تو اپنی میں سرگرداں ہیں) بعض دیگر مفسرین نے یہ معنی بھی کیے ہیں۔ "تیرے زندہ رہنے کی قسم!" یہ بھی کہا گیا ہے۔ "تیری زندگی کی قسم!" اور یہ (اللہ تعالیٰ کا آپ کی حیاتِ طیبہ کی قسم کھانا) آپؐ کی انتہا درجہ کی تعظیم ہے اور آپ کی نہایت درجہ کی پاکیزگی سرشت اور شرافت طبع کی نہایت عمدہ دلیل ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں۔ "اللہ تعالیٰ نے جناب صلی اللہ علیہ وسلم جیسا کوئی دوسرا پیدا کیا اور نہ کوئی آپ جیسا پاکیزہ سرشت انسان پیدا ہوگا[1] جسے اللہ تعالیٰ اپنے اس قدر اعزاز و اکرام سے

---

[1] حضرت حسان رضی اللہ عنہ کیا۔ خوب فرماتے ہیں۔ واحسن منك لم ترقط عینی۔ واجمل منك لم تلد النساء۔ آپ سے زیادہ اچھا میری آنکھوں نے نہیں دیکھا اور نہ آپؐ ایسا خوبصورت کسی عورت نے جنا ہے۔

نوازے (جیسا جناب سردار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو نوازا گیا) اور میں نے (قرآن حکیم یا دیگر کتب سماویہ میں) اللہ تعالیٰ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبّہ کے سوا کسی دوسرے کی زندگی کی قسم کھاتے نہیں سنا۔"

ابو الجوزا رح کہتے ہیں۔ "اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کی عمر کی قسم نہیں کھائی، کیونکہ آپؐ کی ذات ستودہ صفات ہی مخلوق میں بزرگ و برتر ہے۔"

آپ کی ذات مبارکہ کی قسم یٰسٓ ۝ والقراٰنِ الحکیم ۝ انک لمن المرسلین (یٰسین: ۱-۲-۳)

اے سید! اور قرآن حکیم کی قسم یقیناً آپ رسولوں میں سے ہیں۔

مفسرین نے لفظ "یٰسین" کے معنی میں اختلاف کیا ہے۔ اس سلسلہ میں متعدد اقوال ہیں۔

۱۔ ابو محمد مکی رح نے حکایت کی ہے کہ جناب صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ کے ہاں میرے دس نام ہیں۔ پھر آپ نے ان ناموں کا ذکر کیا۔ طٰہٰ اور یٰسین انہی ناموں میں سے دو نام ہیں۔"

۲۔ ابو عبد الرحمٰن سلمی رح نے حضرت جعفر صادق رح سے روایت کی ہے کہ یہاں "یٰسین" سے مراد ہے "اے سید" (صلی اللہ علیہ وسلم)

۳۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رض نے فرمایا "یٰسین" سے مراد ہے "اے انسان!" یہ ایک قسم بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام بھی۔

۴۔ حضرت زجاج رح کہتے ہیں۔ اس کے معنی ہیں "اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم"۔

۵۔ ایک معنی یہ بھی کیے گئے ہیں "اے آدمی!"

۶۔ ایک دوسرے معنی ہیں۔ "اے انسان!"

۷۔ ابن حنیفہ رح کے نزدیک "یٰسین" سے مراد "یا محمد" (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے۔

۸۔ حضرت کعب فرماتے ہیں لفظ "یٰسین" قسم ہے اور یہ قسم اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کی تخلیق سے دو ہزار قبل کھائی تھی۔ اس میں یہی کہا گیا ہے۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! یقیناً آپ رسولوں میں سے ایک ہیں۔

والقراٰن الحکیم ۝ انک لمن المرسلین۔ اور حکمت والے قرآن کی قسم! یقیناً آپ رسولوں میں سے ہیں۔ پس اگر ثابت ہو جائے کہ لفظ "یٰسین" جناب صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک نام ہے تو یہ بھی صحیح ثابت ہو جائے

کہ یہ قسم بھی ہے (یعنی اللہ تعالیٰ آپؐ کے مبارک نام کی قسم کھاتے ہیں واللہ اعلم)

اور یہاں اگر "یٰسین" (اے سید!) سے پکارنے کے معنی لیے جائیں تو اللہ تعالیٰ کا بعد میں قسم کھانا (والقرآن الحکیم" اور قرآن حکمت والے کی قسم!) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رسولؐ ہونے اور ہدایت یافتہ ہونے کی شہادت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور اپنی کتاب (قرآن حکیم) کی قسم کھائی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یقیناً رسول ہیں جو اللہ تعالیٰ کا پیغام لے کر اس کے بندوں کے پاس آئے۔

علیٰ صراطٍ مستقیم - یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایمان و ایقان کی سیدھی راہ پر ہیں۔ ایسی راہ جس میں ٹیڑھ ہے نہ وہ حق سے ہٹ کر ہے۔ حضرت نقاشؒ فرماتے ہیں۔ "اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں جناب صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اپنے نبیوں میں سے کسی کی رسالت کی قسم نہیں کھائی اور اس میں جناب صلی اللہ علیہ وسلم کی نہایت درجہ تعظیم و توقیر ہے جیسے کہ بعض مفسرین کے ان معنی سے مترشح ہے جو انہوں نے کیے ہیں۔ یعنی "اے سردار" وغیرہ جناب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اَنَا سَیِّد وِلد آدمَ وَلَا فخرَ - میں اولادِ آدمؑ کا سردار ہوں، مگر میں یہ فخر کے طور پر نہیں کہتا۔

تیسری آیت

لا اقسم بھذا البلد ۝ وانت حل بھذا البلد ۝ قسم کھاتا ہوں میں اس شہر کی اور تو اس شہر میں داخل ہونے والا ہے۔

شہرِ مکہ کی قسم[1] - اس آیت میں اللہ تعالیٰ یہ فرماتے ہیں۔ "میں اس کے بعد جب اہلِ مکہ آپؐ کو مکہ سے نکال دیں گے۔ اس کی (بزرگی کی) قسم نہیں کھاؤں گا۔ (کیونکہ موجب بزرگی و برکت تو آپ ہیں) یہ معنی شیخ مکیؒ نے حکایت کیے ہیں۔

۲ - یہ بھی کہا گیا ہے کہ لا اقسم میں "لا" زائدہ ہے۔ اس نظریہ کی رُو سے یہ معانی ہوں گے یعنی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ "میں اس شہر مکہ کی قسم کھاتا ہوں، کیونکہ آپؐ اس شہر میں مقیم ہیں" (اور اس کے لیے باعثِ کرامت ہیں) اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! آپ کے لیے حلال ہے یا حلال کر دیا گیا ہے جو کچھ آپ اس شہر میں

---

[1] اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں شہر مکہ کو امن والا شہر فرما کر اس کی کرامت اور بزرگی کی قسم کھائی ہے مثلاً والتین ۝ والزیتون وطورِ سینین وھذا البلد الامین ۝ انجیر، زیتون، طور سینا اور اس پُرامن شہر (مکہ) کی قسم (مترجم)

عمل کریں۔

(یہ دو تفسیریں ہیں) " آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس شہر میں رہ کر عمل کرنا ہی اس کی فضیلت کا موجب بنا۔ یہاں شہر سے مراد "شہر مکہ" ہے، مگر حضرت واسطیؒ کہتے ہیں۔ "ہم آپ کی وجہ سے اس شہر کی قسم کھاتے ہیں، کیونکہ اس شہر کی عظمت و رفعت آپکے دم قدم سے ہے، کیونکہ آپ نے یہاں قیام فرمایا، یہیں ایامِ حیات گذارے یہاں ہی آپ نے وفات فرمائی (اسی شہر میں آپ کا جسد اقدس مدفون ہے) لہٰذا اس شہر نے (ہمیشہ ہمیشہ کی) برکت پائی۔ حضرت واسطیؒ کا کلام اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ یہاں شہر سے مراد مدینۃ النبیؐ ہے مگر پہلے معنی (یعنی شہر مکہ) زیادہ صحیح ہیں، کیونکہ و انت حِلٌّ بھذا البلد۔ سے بھی ہمارے فیصلہ کی توثیق ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں علامہ ابن عطاؒ نے آیت وھذا البلد الامین۔ کی تفسیر میں جو کچھ لکھا ہے وہ بھی ہمارے قول (یعنی یہاں شہر سے شہرِ مکہ مراد ہے) سے مناسبت رکھتا ہے۔ علامہ ابن عطاؒ مزید فرماتے ہیں۔ "اللہ تعالیٰ نے اس شہر کو آپ کے یہاں پیدا ہونے اور رہائش پذیر ہونے کی وجہ سے پُرامن شہر (بلد الامین) بنایا کیونکہ آپ کا وجود مبارک تو موجب امن و سکون ہے چاہے آپ جہاں کہیں ہوں۔"

ووالدٍ وّما ولد۔ اور قسم ہے جنانیوالے کی اور جس کو جنا۔

جس نے کہا کہ والد سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں اس کے نزدیک مَا وَلَدَ سے عام اولاد آدم مراد ہے اور جس مفسر نے "والد" سے حضرت ابراہیم علیہ السلام مراد لیے ہیں اس کے نزدیک "مَاوَلَدَ" سے جناب صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں۔ اس طرح اس سورہ (البلد) میں دو مقام۔ أنت حلٌّ بھذا البلد اور مَاوَلَدَ پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قسم کھائی ہے۔

الٓمٓ ۚ ذٰلِكَ الكتاب لاریب فیه۔ الٓمٓ۔ یہ وہ کتاب ہے جس میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں یہ حروف (ا۔ل۔م) قسمیں ہیں۔

حضرت سہل بن عبداللہ تستریؒ فرماتے ہیں۔ "یہاں الف سے مراد اللہ تعالیٰ، میم سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور لام سے جبرائیل علیہ السلام مراد ہیں۔"

حضرت شیخ ابواللیث سمرقندیؒ اپنی تفسیر میں یہی قول نقل کرتے ہیں، مگر اسے کسی کی طرف منسوب نہیں کرتے۔ انہوں نے الٓمٓ کے معنی یہ بیان کیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جبرائیل کو قرآن (جس کی صداقت میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں) دیکر جناب صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھیجا۔

یہاں پہلی بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی، جبرائیل اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم (جو یہاں ہمارا موضوع ہیں) کی قسم کھا کر قرآن حکیم کے بے شک وشبہ ہونے کی خبر دی دوسرے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پاک اپنے مبارک نام کے ساتھ ملا کر آپ کی رفعتِ شان میں اضافہ فرمایا۔

قٓ ۝ والقرآن المجید ۝ قٓ اور قسم قرآن بزرگ کی۔

یہاں قٓ سے مراد جناب صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب (دل) ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے دل کی طاقت کی قسم کھائی ہے کہ وہ اتنا قوی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے خطاب کی عظمت اور تجلیات الٰہیہ کی جلالتِ شان کے باوجود ہراساں نہیں ہوتا۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں "ق" سے مراد قرآن حکیم کا ایک نام ہے۔ بعض نے کہا یہ اللہ تعالیٰ کا ایک نام ہے جبکہ بعض نے یہ بھی کہا کہ یہ ایک پہاڑ کا نام ہے جو زمین کو احاطہ کیے ہوئے ہے وغیرہ۔

والنجم اذا ھوٰی ۔ قسم ہے تارے کی جب ٹوٹ پڑے۔

۱۔ حضرت جعفر بن محمدؒ فرماتے ہیں کہ یہاں "نجم" سے جناب صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ پاک مراد ہے۔

۲۔ بعض نے کہا یہاں نجم سے جناب صلی اللہ علیہ وسلم کا "دل" مراد ہے اور "ھوی" کے معنی ہیں اس کا انوارِ الٰہیہ سے (بھلائی کے لیے) کھل جانا اور "ھوٰی" کے معنی یہ بھی کیے ہیں کہ یہاں آپ کے دل کا غیر اللہ سے مکمل انقطاع مراد ہے۔

والفجر ۝ ولیالٍ عشرٍ ۝ فجر اور دس راتوں کی قسم۔

حضرت علامہ ابن عطاءؒ فرماتے ہیں کہ یہاں "الفجر" سے جناب صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مراد ہے۔ کیونکہ جس طرح فجر سے روشنی پیدا ہوتی ہے اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نور ایمان پھوٹتا ہے۔

"جامعہ مدنیہ" میں

۱۵ رجب مطابق ۲۵ اگست بروز جمعہ حضرت مولانا عبدالشکور دین پوری مدظلہم نمازِ جمعہ سے قبل معراج النبیؐ کے موضوع پر تقریر فرمائیں گے۔ اور ۲۱ رجب مطابق ۳۱ اگست (پنجشنبہ) بعد نماز عشاء حضرت علامہ مولانا دوست محمد صاحب قریشی مدظلہم اسی موضوع پر خطاب فرمائیں گے۔ مسلمانانِ لاہور سے شرکت کی درخواست ہے ـــــ (مولانا) شیر محمد سرگودھوی۔

فضیلتِ علم اور اہلِ علم

تقریر : حضرت علامہ مولانا شمس الحق صاحب افغانی مدظلہم

ترتیب : حبیب الرحمٰن اشرف

○

شیخ التفسیر حضرت علامہ مولانا شمس الحق صاحب افغانی مدظلہم العالی کی طبیعت ان دِنوں کچھ زیادہ ہی علیل ہے — معالجین نے انہیں مکمل آرام کا مشورہ دیا ہے۔ اس لیے حضرتِ موصوف اپنے گرانقدر مضمون "سیرۃ نبوی اور مستشرقین" کی اگلی قسط ارسال نہیں فرما سکے ہیں۔ نامۂ گرامی میں تحریر فرمایا ہے کہ جونہی صحت بحال ہوجائیگی مضمون کی تکمیل کردونگا۔ لہٰذا ہم اس بار حضرت موصوف کی ایک تقریر جو آپ نے بہت پہلے جامعہ مدنیہ میں ارشاد فرمائی تھی پیش کر رہے ہیں — قارئین کرام سے گذارش ہے کہ حضرت علامہ مدظلہم العالی کی صحت و تندرستی کے لیے خصوصی دعائیں کریں۔ بلاشبہ اس پُرآشوب دور میں نت نئے وجود میں آنے والے فتنوں کے استیصال کے لیے حضرت علامہ ایسی گوناگوں کمالات سے متصف ہستی کی بہت ضرورت ہے۔ آپ فیلسوفِ اسلام ہیں۔ جید و متبحر عالم، صاحبِ تدبر و فراست اور نکتہ رس و نکتہ سنج ہیں۔ ایسی شخصیت ہم سب کے لیے مغتنماتِ دہر میں سے ہے۔ حق تعالیٰ ان کا سایہ دیر تک ہم پر قائم رکھے اور مسلمانانِ پاکستان ان کے فیوض و برکات سے دیر تک متمتع ہوتے رہیں۔ آمین۔ (ادارہ)

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۔ (پ ۲۳ - ع ۱۵)

معزز حاضرین، علماء و اساتذہ کرام اور طلبۂ جامعہ مدنیہ! میں نے قرآن مجید کی ایک آیت پڑھی ہے۔ اس وقت مجھے تین باتیں عرض کرنی ہیں۔ پہلی بات علم دین کا مقام، دوسری علم دین سے متعلق فرائض اور تیسری علم کے فرائض سے کوتاہی کے نقصانات۔

مقامِ علم اور اہلِ علم | علمِ دین اور اہلِ علم کا مقام اس آیت میں بیان کیا گیا ہے اس آیت میں تین الفاظ ایسے استعمال ہوئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں علم دین اور عالم کا مقام بہت اونچا ہے۔ قرآن کی عام اصطلاح یہ ہے کہ اہم اعلان شاہی طریقہ سے کیا جاتا ہے۔ خود ہر حکومت کا یہ دستور ہے کہ ضروری اعلان ایک خاص طریقہ سے کرتی ہے۔ حکومت روزانہ کوئی نہ کوئی کام کرتی ہی رہتی ہے۔ لیکن جب اہم معاملہ ہوتا ہے، مثلاً جنگ، دن یونٹ

قحط وغیرہ تو باقاعدہ اعلان کیا جاتا ہے، قرآن بھی مقاصدِ مہمہ کے متعلق باقاعدہ اور شاہی اعلان لفظِ "قل" سے کرتا ہے۔ یہاں بھی اہمیت کے لیے لفظ "قل" سے اعلان فرمایا ارشاد ہے:

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُوا الْأَلْبَابِ۔

(بتلا دیجیے کیا علم والے اور بے علم برابر ہو سکتے ہیں؟ سمجھتے وہی ہیں جو عقل والے ہیں)

علمی نکتہ علامہ تفتازانی نے لکھا ہے کہ "استفہام انکاری" بعض اوقات توبیخ کے لیے ہوتا ہے تو گویا یہاں اللہ تعالیٰ نے ڈانٹ پلائی، عالمِ دین اور غیر عالمِ دین کو برابر کہنے والے کو، جو شخص غیر عالمِ دین کو خواہ گورنر ہو یا بادشاہ یا یورپ کی یونیورسٹیوں کا سند یافتہ، عالم دین کے برابر سمجھے گا وہ حق تعالیٰ کے قہر اور اس کی ڈانٹ کے نیچے آجائے گا، کیونکہ علم دین کا مقام بہت اُونچا ہے، جو علمِ دین نہیں رکھتا ہے وہ خواہ کرۂ ارضی کا واحد بادشاہ کیوں نہ ہو، عالمِ دین سے کم ہے۔ اللہ اپنے کلام عظیم میں کسی کا صرف نام لے لے تب بھی فخر ہے، کیونکہ اس کی ذات بہت بلند ہے، لیکن یہاں تو عالمِ دین کی نہایت زوردار تعریف فرمائی ہے۔

علمی نکتہ تیسری بات جو اس آیت میں بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ باوجودیکہ يَعْلَمُونَ فعل متعدی ہے لیکن اس کا مفعول ذکر نہیں کیا۔ یعنی یہ تو فرمادیا گیا کہ علم رکھتے ہوں، لیکن یہ نہیں ذکر کیا گیا کہ کس چیز کا علم رکھتے ہوں، کیونکہ بتانا یہ ہے جب علم کا لفظ بولا جاتا ہے تو مفہوم اس کا متعین ہوتا ہے۔ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ جیسے جوتی کا مفہوم متعیّن ہے کہ پاؤں کے لئے ہوتی ہے اور جیسے ٹوپی کا کہ سر کے لیے ہوتی ہے۔ (یعنی جوتی کے تلفظ کے ساتھ اگر پاؤں کا ذکر نہ بھی کریں تو بھی سمجھ میں آجاتا ہے کہ یہ پاؤں کے لیے ہے اسی طرح ٹوپی کے تلفظ سے اس کا مفہوم اور مقام یعنی "سر" لامحالہ سمجھ میں آجاتا ہے۔ وغیرہ) اسی طرح علم کا مفہوم بھی متعین ہے۔ یعنی "علمِ دین"۔ مطلب یہ ہے کہ علم کا متعلق دین ہے۔ گو علوم دنیویہ بھی ہوتے ہیں، لیکن قرآن نے مفعول کو حذف کرکے بتلایا کہ یہ علمِ دین اتنا متعین ہے کہ ذکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ جب بھی علم کا لفظ بولا جائے گا تو سب سے پہلے علم دین ہی سمجھا جائیگا۔ اس تعین کی وجہ سے اس کے (یعنی مفہومِ علم یا مفعولِ یعلمون کے) تذکرہ کی حاجت نہیں۔ دیکھیں! علمِ دین بھی علم ہے اور علم دنیا بھی علم ہے، لیکن جس علم کا "معلوم" بلند ہوگا وہ علم بھی بلند اور جس کا "معلوم" پست وہ علم بھی پست ہوتا ہے۔ علم دنیا رکھنے والے رومیوں کو (یعنی اہل یورپ کو کیونکہ قدیم جغرافیہ میں روم یورپ کا نام ہے۔ مفسرین کی تحقیق یہی بتاتی ہے) خدا تعالیٰ نے قرآن میں لایعلمون کہا ہے۔ اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے

اسے معلوم تھا کہ یہ ہوا پر اڑیں گے۔ یہ کریں گے وہ کریں گے، لیکن پھر بھی انہیں لایعلمون (یعنی بے علم) کہا۔
ایک اور جگہ ارشاد ہے۔ یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ۝ (پ ۲۱ ع ۴)
(یعنی دنیا کی زندگی کی ظاہر باتیں جانتے ہیں اور آخرت سے غافل ہیں)
مطلب یہ کہ دنیا کو تو جانتے ہیں، لیکن آخرت سے بے خبر ہیں اور آخرت کے مقابلہ میں یہ دنیا صفر ہے۔

یہ بھی غور کریں کہ اگر علم فقط دانستن (جاننا) کا نام ہے پھر تو امورِ مملکت کو جاننے والا وزیر اعظم اور ٹٹی کا علم رکھنے والا (بھنگی) برابر ہیں کیونکہ "دانستن میں" دونوں شریک ہیں۔ تو کیا کوئی وزیرِ اعظم، بیرسٹر اور ایم اے کے مقابلہ میں کسی بھنگی کو تعلیم یافتہ کہے گا؟ ہرگز نہیں۔ بھائی! علم اگر صرف دانستن کو کہتے ہیں پھر تو سب کو تعلیم یافتہ کہنا چاہیئے لیکن چونکہ بھنگی کا "معلوم" (جو چیز وہ جانتا ہے) پست ہے اس لیے اس کا علم بھی پست ہے اور اس لیے کوئی اسے تعلیم یافتہ نہیں کہہ سکتا تو حق تعالیٰ کے نزدیک یہ دنیا پاخانہ سے بھی کم ہے اس لیے دنیا کا علم جاننے سے کوئی عالم نہیں کہلایا جاسکتا۔

آگے فرمایا۔ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ۔ (یعنی عقل والے ہی اس کو سمجھتے ہیں۔)
یہاں حصر کا کلمہ ارشاد فرمایا۔ جب یہ اعلان کر دیا کہ دین کا عالم سب سے اونچا ہے۔ چاہے غیر عالم کرۂ ارضی کا واحد بادشاہ کیوں نہ ہو۔ اب فرماتے ہیں کہ جو عالمِ دین کو غیر عالم کے برابر سمجھتا ہے وہ بے عقل ہے۔

علامہ جلال الدین سیوطی نے روایت کی ہے کہ قیامت کے دن پہلے انبیاء شفاعت کریں گے۔ پھر علماء، پھر شہداء، معلوم ہوا کہ عالمِ دین کا عہدہ بہت بڑا عہدہ ہے۔ اس کا مقابلہ دنیا کا کوئی عہدہ نہیں کر سکتا، یہ ہوا مقامِ علم و مقامِ علماء۔

عالم کے فرائض ہر عہدہ کے ساتھ فرائض ضرور ہوتے ہیں عہدہ جتنا بڑا ہوتا ہے۔ فرائض اتنے ہی زیادہ ہوتے ہیں۔ چپڑاسی کے فرائض سے تحصیلدار کے فرائض زیادہ ہوتے ہیں اور تحصیلدار کے فرائض سے کمشنر کے اور کمشنر کے فرائض سے گورنر کے فرائض زیادہ ہوتے ہیں۔ گویا عہدہ کے مطابق فرائض ہوتے ہیں۔ عالمِ دین کا عہدہ چونکہ تمام عہدوں سے بڑا ہے اس لیے اس کے فرائض بھی سب سے زیادہ ہیں۔

ارشاد ہے: وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ (پ ۴ - ع ۲)
(اور چاہیئے کہ تم میں سے ایک جماعت ایسی ہو جو نیک کام کی طرف بلاتی رہے اور اچھے کاموں کا

حکم کرتی رہے اور بُرے کاموں سے روکتی رہے۔ اور وہی لوگ نجات پانے والے ہیں۔)

فرمایا جو دعوتِ خیر دے، یعنی نیکیاں پھیلائے، بُرائیاں مٹائے، وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں تو عالم بن جانے کے بعد خطیب، استاد، ٹیچر دینیات وغیرہ بن جانے سے فرائض ختم نہیں ہوتے۔ بلکہ یدعون الی الخیر۔ خطیب خطابت کے علاوہ، ٹیچر ٹیچری کے علاوہ لوگوں کو بھلائی کی دعوت بھی دے۔

فرائض سے کوتاہی کے نقصانات عالم جو علم حاصل کرے۔ اسے اپنے سینہ تک محدود نہ رکھے، بلکہ پھیلائے۔ اگر پھیلانے کی سعی کی تو فرض ادا کیا ورنہ اس گورنر یا کمشنر کی طرح ہے جو عہدہ تو بڑا لیے ہوئے ہے لیکن صبح سے شام تک سویا رہتا ہے۔ کام کوئی نہیں کرتا۔ عہدہ کے متعلق فرائض ادا نہیں کرتا۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ سب سے بڑا عذاب اس عالم کو ہوگا جس کے علم سے دوسروں کو فائدہ نہ پہنچے۔ ایک طرف اگر عالم دین کو بہت بڑا عہدہ دیا گیا تو دوسری طرف بہت سے فرائض اس کے ذمہ لگا دیئے گئے اگر ان فرائض کو بجا لایا تو یہ علم سراپا منفعت ہے ورنہ سراپا مضرت ہے۔

خداوند کریم نے عالم کو بہت بڑا عہدہ اور عزت دی ہے جس کی قدر کرنی چاہیئے۔ اگر آپ کہیں کہ آجکل تو کوئی عزت نہیں۔ آج کل اگر عزت ہے تو صاحبِ اقتدار یا اربابِ دولت کی ہے تو یہ شیطانی وسوسہ ہے۔ اللہ کی نظر میں عالمِ دین ہی عزیز ہے۔

حدیث شریف میں ہے۔ خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ۔

(تم میں بہتر وہ ہے جو سیکھے قرآن مجید اور سکھائے۔)

حدیث میں "خیریت" کا مقام ذکر ہے۔ اس میں معلّم سے متعلم کو مقدم رکھا ہے۔ یا تو اس لیے کہ تعلّم (یعنی سیکھنا) پہلے ہوتا ہے۔ تعلیم (یعنی سکھانا) بعد میں اور یا اس لیے کہ متعلم کو اکثر سفر کرنا پڑتا ہے معلّم کو نہیں۔ معلّم تنخواہ پاتا ہے متعلم نہیں پاتا۔ معلّم کو اور بھی بہت سی ایسی سہولتیں میسّر ہوتی ہیں جو متعلّم کو میسر نہیں ہوتیں۔ اسلیے متعلّم کی تکالیف کے پیشِ نظر خیریت کے مقام میں اس کو مقدم فرمایا۔

لطیفہ ایک دفعہ مجھ سے کسی نے پوچھا کہ تم کہتے ہو کہ عالمِ دین کی بہت عزت ہے، لیکن ایسا نہیں، آجکل ان کی کوئی عزت نہیں۔ میں نے کہا کس کے ہاں عزت نہیں خدا کے ہاں یا لوگوں کے ہاں؟ اس نے کہا لوگوں کے ہاں۔

اس زمانہ میں لیاقت علیخاں وزیرِ اعظم تھے۔ میں نے جواب میں کہا کہ ایک آدمی ہے اس کی لیاقت علیخاں

کے ہاں تو بڑی عزت ہے مگر "رام کلا" کے دل میں اس کی کوئی قدر و منزلت نہیں (رام کلا میرا ملازم تھا جو میرے بنگلے کی صفائی کرتا تھا) بتاؤ وہ شخص عزت والا ہے یا نہیں۔ اس نے کہا وہ شخص یقیناً عزت والا ہے جس کی عزت لیاقت علیخاں کرتا ہے بھلا وہ کیسے صاحبِ عزت نہیں ہوگا۔ ہزار رام کلے اسے ذلیل سمجھیں، جب لیاقت علی خاں کے ہاں اس کی عزت ہے تو رام کلا کون ہوتا ہے۔ میں نے کہا کہ رام کلا تو پھر پھر بھی لیاقت علیخاں کے ساتھ انسانیت میں شریک ہے، کیونکہ انسانی صفات دونوں میں پائی جاتی ہیں لیکن خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں تو دنیا کے بڑے سے بڑے آدمی کی بھی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ تو جب وہ آدمی ذلیل نہیں جس کی عزت لیاقت علی خاں کرتا ہے تو وہ کیسے ذلیل اور بے عزت ہو سکتا ہے جس کی خدا کے ہاں عزت ہو۔

ایک قصہ ایک دفعہ کوئٹہ کی ایک مسجد میں والیٔ قلات نے مجھ سے کہا کہ علماء کی کوئی عزت نہیں ہے کیا وجہ ہے؟ میں ابھی جواب دینے بھی نہ پایا تھا کہ مسجد کے دروازے پر ایک عورت نے مجھ سے کہا۔ مولوی صاحب! میرے اس لڑکے کو دم کر دو اور ہاتھ پھیرو۔ یہ بیمار ہے۔ والیٔ قلات کھڑے دیکھتے رہے۔ میں نے لڑکے کو دم کر کے والیٔ قلات سے کہا کہ خدا نے آپکے سوال کا جواب مجھ سے پہلے دیدیا۔ غور کیجیے میں پشاور کا رہنے والا ہوں یہاں کا رہنے والا نہیں۔ یہ عورت بھی بلوچ ہے اور آپ بھی بلوچ ہیں، ہے بھی آپ کی رعایا، لیکن کیا وجہ ہے کہ اس نے آپ سے ہاتھ پھیرنے کو نہیں کہا اور مجھ سے کہدیا؟ کیا میرے ہاتھ سونے کے اور آپ کے چاندی کے ہیں۔ دیکھیے! اس عورت نے مجھے اہلِ علم میں سے سمجھا۔ علم کی عزت اس کے دل میں تھی اسلیے مجھ سے کہا اور آپ سے نہ کہا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ (پ ۲۸ - ع ۲)

تم میں اللہ ایمانداروں کے اور ان کے جنہیں علم دیا گیا ہے درجے بلند کرے گا۔

علم کی عزت رہے گی۔ یہ قدر و منزلت رہتی دنیا تک باقی رہے گی۔ غریب مولوی جس کے پاس پاؤ بھر آٹا بھی نہیں ہوتا لوگ اس کے پاس تو برکت کے لیے ہاتھ پھروانے آتے ہیں، لیکن وائسرائے وغیرہ کے پاس نہیں جاتے۔ کیوں؟ اس لیے کہ خدا نے علماء کو خاص ہی عزت دی ہے۔

تکالیف علمِ دین کے ساتھ ساتھ تکالیف بھی ہوتی ہیں۔ یہ وراثتِ نبوّت ہے۔ آپ تو ماشا اللہ پھر بھی اچھے ہیں۔ گذشتہ علماء کرام نے تو بہت زیادہ تکلیفیں برداشت کی ہیں۔ ابو حیان توحیدی سلیمان کے

شاگرد تھے۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ فارابی اور ابن سینا سے ان کا علمی مقام بلند تھا۔ وہ اپنے استاد کے متعلق لکھتے ہیں کہ ان کو ایک رائی کی بھی استطاعت نہیں تھی۔ لُغت کے سب سے بڑے امام خلیل ابن احمد جس جگہ پڑھاتے تھے، جب اس جگہ سے ہجرت کرنے لگے تو شاگرد بہت پریشان ہوئے۔ استاد نے کہا کاش دن رات میں اگر آدھ سیر باقلا (باقلہ) بھی ملتا تو کبھی نہ جاتا، لیکن نہ مجھ میں قوت ہے اور نہ تم تین سو شاگردوں میں یہ قدرت ہے کہ آدھ سیر باقلا کہیں سے لے آیا کرو۔

ایک بات یہ بھی بتادوں کہ ناواقف لوگوں کے اعتراضات سے ہرگز تنگ نہ ہونا چاہیے، ایسا ہوتا ہی رہا ہے۔

امام رازی جو بہت بڑے امام بھی تھے اور بہت بڑے دولت مند بھی۔ جنہوں نے شہاب الدین غوری کو اسّی لاکھ روپے دیئے تھے گویا ان کے پاس علم کی دولت بھی تھی اور ظاہری یعنی دنیاوی دولت سے بھی مالا مال تھے۔ وہ جب منبر پر خطبہ دینے کھڑے ہوتے تو لوگ پرچیوں پر مختلف قسم کے اعتراضات لکھ پیش کرتے آپ ان پرچیوں کو پڑھ لیتے، لیکن ان کا جواب نہ دیتے۔ جواب میں صرف یہ شعر کہہ دیا کرتے تھے

اَلْمَرْءُ مَادَامَ حَیًّا یُسْتَهَانُ بِهٖ وَیَعْظُمُ الرَّزْءُ فِیْهِ حِیْنَ یَفْتَقَدُ۔

آدمی جب تک زندہ رہتا ہے اسکی بے قدری کی جاتی ہے اور جب وہ (مرکر) جاتا رہتا ہے تو اسکا فقدان بڑی مصیبت ہوتی ہے۔

میرے عزیز طلبہ! کسی کی ترشروئی سے ہرگز دل برداشتہ نہ ہوں، لوگوں کے اعتراضات کی پرواہ نہ کریں، علم کو سیکھیں، پھیلائیں۔ خود بھی اس پر عمل کرتے رہیں اور لوگوں کو بھی عمل کی دعوت دیں۔ یاد رکھو عمل کے بغیر علم وبال ہے۔

حضرت مدنی قدس سرہٗ میں ایک دفعہ دیوبند گیا وہاں حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے گھر مہمان ہوا۔ حضرت مدنیؒ خود گھر نہیں تھے۔ میں رات کو ایک کمرے میں سویا ہوا تھا۔ کروٹ جو بدلی تو آنکھ کھلی۔ دیکھا تو مولانا مدنیؒ ایک چٹائی پر جو میری چارپائی کے بالکل قریب تھی لیٹے ہوئے تھے۔ سر کے نیچے اینٹ رکھی تھی۔ مجھے بہت شرم آئی۔ خیال کیا کہ حضرت کو اب جگانا مناسب نہیں ہے۔ ذرا دیر ہوئی تو دیکھا کہ حضرت مدنیؒ نوافل میں مشغول ہیں۔ صبح ہوئی تو پوچھا کہ حضرت! یہ کیا غضب کیا۔ نیچے کیوں آرام فرمانے لگے۔ مجھے اٹھایا کیوں نہیں۔ فرمایا یہ اکرام ضیف (عزتِ مہمان) ہے۔ کیا آپ نے یہ حدیث نہیں پڑھی۔ من کان یؤمن باللہ والیوم الاخر فلیکرم ضیفہ (جو کوئی اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کو لازم

ہے کہ مہمان کی عزت کرے) پھر فرمایا دیکھیے ! آج مولوی پڑھتے تو ہیں ، مگر عمل نہیں کرتے ۔
میں اپنے ساتھ ایک من کے قریب کوئٹہ کے عمدہ انگور لے گیا تھا ۔ وہ حضرتؒ نے حاضرینِ مجلس میں تقسیم کر ڈالے ۔ گھر سے خادمہ آئی ۔ کہنے لگی ، سنا ہے افغانی صاحب انگور لائے ہیں گھر کے لیے بھی دید یجیے فرمایا ۔ اب آگئی ہو ، وہ تو تقسیم بھی ہو گئے ۔ پھر روٹی کھانے کا وقت آیا تو ہاتھ دھلانے کے لیے خود لوٹا اٹھایا ۔ میں نے عرض کیا حضرت ! یہ کیا کر رہے ہیں ؟ میں خود دھو لوں گا مگر وہ دھلانے پر مُصر رہے میں نے پھر عرض کیا کہ جناب اس لڑائی سے کیا فائدہ ؟ میری طبیعت مکدّر ہو گی ، طبیعت پر بوجھ رہے گا ۔ کیا یہی اکرامِ ضیف ہے ۔ اکرامِ ضیف تو یہ ہے کہ بوجھ نہ پڑے ۔ فرمایا ۔ شرعی حکم میں بوجھ ہو تو رہے ۔ شرعی حکم اکرام ہے وہ میں بہر حال بجا لاؤں گا خواہ بوجھ ہو یا نہ ہو ۔ پھر میں نے کہا کہ رات حضرت نے آرام تو کیا ہی نہیں ۔ فرمایا صرف آج رات نہیں گذشتہ نو راتوں میں ایک لمحہ بھی نہیں سو سکا ۔ (واہ مدنی ! تجھ پر خدا کی کروڑوں رحمتیں نازل ہوں ۔)
اللہ تعالےٰ ہمیں ایسے نیک لوگوں کے نقشِ قدم پر چلائے ۔ اللہ آپ کے علم میں برکت دے ۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین ۔

المکۃ پریس

خلیق و دیانتدار عملہ
بہترین و با رعایت طباعت

۵ ۔ شارع فاطمہ جناح ، لاہور

ہمارے یہاں ٹیکسٹائل ملز کے سپیئر پارٹ اور ہر قسم کے سپرنگ تیار ہوتے ہیں

پاکستان سپرنگ مینوفیکچرنگ کمپنی

برانڈرتھ روڈ ، رام گلی نمبر ۱ ، لاہور : فون 66065

جمہوریت اپنے آئینے میں

اور

اِسلامی نظامِ حکومت کا مختصر خاکہ

شیخ الحدیث حضرۃ علامہ مولانا سیّد محمّد میاں صاحب مدظلہ

اسلامی مملکت میں جملہ اختیارات ایک ہی کو دیئے جاتے ہیں۔ اسکو امام کہا جاتا ہے۔ جو پوری مملکت کا واحد سربراہ ہوتا ہے۔ قرآن پاک کی تعلیم یہ ہے کہ وہ سربراہ اقتدار میں سب سے اعلیٰ ہو تو تقویٰ، پرہیزگاری اور خداترسی میں بھی ان کو سب سے بلند ہونا چاہیئے۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ

علماء نے امام کے لیے چند شرطیں اسی لیے قرار دی ہیں کہ حتی الامکان قرآن پاک کی تعلیم کو جامۂ عمل پہنایا جاسکے۔ مثلاً عاقل، بالغ، تندرست، صحیح الحواس، صاحبِ ہمت، صاحبِ حوصلہ، صائب الرائے سیاسی امور کا واقف و ماہر، جنگ و صلح کے نشیب و فراز سے باخبر، خلق خدا کا ہمدرد، عوام کا خیر خواہ، مختلف طبقات کے مزاجوں سے واقف ہونے کے علاوہ اہم شرط یہ ہے کہ اس میں عدل ہو۔ یعنی پابندِ شرع ہو۔ اسلامی اخلاق کا حامل ہو، کبائر کا مرتکب نہ ہوتا ہو۔ بتقاضائے بشریت گناہ ہوجائیں تو فوراً توبہ کرلے، کسی گناہِ صغیرہ کا بھی عادی نہ ہو عالم ہو اور اسلامی علوم میں بصیرت رکھتا ہو (ازالۃ الخفاء۔ حجۃ اللہ البالغہ و شرح عقائد نسفی وغیرہ)

وزیراعظم کی جو حیثیت ہندوستان جیسے آج کے جمہوری ممالک میں ہے کہ پارلیمنٹ یا اسمبلی میں جس سیاسی پارٹی کو اکثریت حاصل ہو اس کا لیڈر وزیراعظم یا چیف منسٹر ہو، اسلامی تعلیمات میں اس طرز کی اگر ممانعت نہیں کی گئی تو اس کی ہدایت بھی نہیں کی گئی۔

جمہوریت پر ایک نظر کوئی بھی موسم ہو اس میں اس موسم کے خاص پھل کی بہار ہوتی ہے۔ زبانوں پر اس کا تذکرہ ہوتا ہے، دلوں میں اس کی رغبت اور خواہش، بازار اور منڈیوں میں اس کی کثرت ہوتی ہے۔ تجربہ نے

چہرۂ جمہوریت کے خوشنما اور دلکش غازہ کو بڑی حد تک کھُرچ دیا ہے، مگر تقریباً چالیس سال پہلے کا دور وہ تھا جس میں یورپ کی استعمار پسند حکومتیں دُنیا پر چھائی ہوئی تھیں۔ وہ دور تصورِ جمہوریت کا موسم بہار تھا۔

شکنجۂ استعمار میں کسی ہوئی قوموں کے مضطرب جذبات تصورِ جمہوریت کا استقبال کر رہے تھے۔ اور یہ تصور اہلِ دانش، اہلِ نظر اور اصحاب فکر کی عقل و دانش پر یہاں تک چھایا ہوا تھا کہ وہ کھینچ تان کر اسلام کو بھی اپنی ہی صف میں کھڑا کرنا چاہتے تھے کہ جمہوریت کے جس تخیل کو وہ متاعِ بے بہا سمجھ رہے ہیں اسلام بھی اس کی تعلیم دیتا ہے اور بازارِ سیاست میں اس کا خریدار ہے۔

لیکن اگر ہم جذبات سے بالا ہو کر حقیقت کو سامنے رکھیں تو حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی مذہب جمہوریت کی موافقت نہیں کر سکتا۔ جس طرح جمہوریت۔ اگر صحیح معنی میں جمہوریت ہے تو وہ مذہب کے تابع نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ہم جمہوریت کے ثنا خواں و مدّاح اس لیے ہوتے ہیں کہ اس میں عوام کو آزادی میسر آتی ہے۔ رائے کی آزادی، فکر کی آزادی، تحریر کی آزادی، تقریر کی آزادی، مطلق العنان حریت یعنی بے لگام آزادی۔ حالانکہ کوئی بھی مذہب اس مطلق العنان، بے لگام اور منہ چھوٹ آزادی کی اجازت نہیں دے سکتا۔ ہر ایک مذہب اخلاق کا طوقِ زرّیں انسان کے گلے میں ڈالتا ہے۔ اس کا اصل اصول ہوتا ہے پابندی، فرمانبرداری، ضبط و کنٹرول، ایثار اور قربانی۔ اس کے برعکس مطلق العنان آزادی جو جمہوریت کا طرّۂ امتیاز مانی جاتی ہے، رفتہ رفتہ آوارگی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

آپ تحقیق فرمائیں تو مہذّب ترین جمہوری ممالک کاروباری ضابطوں اور قاعدوں میں وہ خواہ کتنے ہی با اصول ہوں، مگر اخلاق، کردار، روحانیت، خوفِ خدا اور خدا پرستی کے لحاظ سے وہ آوارہ اور شورہ پشت ہیں۔

بیشک جمہوریت کا یہ رُخ قابلِ قدر ہے کہ اصولاً ایک فرقہ کو دوسرے پر مسلط نہیں کرتی۔ اگرچہ عملاً اس سے نجات بھی نہیں مل سکتی۔ کیونکہ اکثریت اگر کسی ایک فرقے سے تعلق رکھتی ہے تو وہ لامحالہ اپنی چھاپ جمہوریت پر ڈال دیتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ یہ سمجھنے لگتی ہے کہ جمہوریت کے معنی ہیں اکثریت کے ہم رنگ ہونا۔

فریب نظر اور طلسم | جمہوریت اور ڈیماکریسی کے ثنا خواں جمہوریت کی خوبی یہ بیان کرتے ہیں کہ جمہوریت میں اقتدارِ اعلیٰ جمہور کو حاصل ہوتا ہے۔ حکومت جمہور کی ہوتی ہے۔ اصل اختیارات جمہور کو حاصل ہوتے ہیں وہ اپنے لیے اپنی مرضی کے مطابق دستور اساسی (CANSTITUTON) اور قانون تجویز کر سکتے ہیں، لیکن حقیقت پسندانہ نظر ڈالی جائے تو یہ تمام الفاظ طلسم اور جادو کے منتر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ جو دماغوں کو

مسحور ضرور کر لیتے ہیں، مگر حقیقت اور واقعیت سے آشنا نہیں ہوتے۔

جمہور کے پاس ووٹ کی طاقت ضرور ہوتی ہے، مگر کیا اس حقیقت سے انکار ہو سکتا ہے کہ جس طرح گری نکال دینے کے بعد بادام کا چھلکا، کوڑا کرکٹ یا ایندھن بن جاتا ہے۔ ووٹ دینے والے بھی ووٹ دینے کے بعد بے مغز پوست بلکہ گرد پا بن جاتے ہیں۔

کہا جا سکتا ہے کہ مغز ہی اصل ہے بادام کی گری ہی بادام کا حاصل ہے۔ اگر گری کام آ رہی ہے تو بادام بے کار نہیں گیا اور ضائع نہیں ہوا۔ عوام کے نمائندے اگر قانون بنا رہے ہیں تو وہ قانون عوام ہی کا بنا ہوا قانون ہے۔ اگر وہ نمائندے حکومت کر رہے ہیں تو وہ عوام ہی کی حکومت ہے۔

مگر کیا واقعی یہی ہوتا ہے کہ قانون عوام کے نمائندے بناتے ہیں اور عوام کے نمائندے ہی حکومت کرتے ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ ۸۰ فیصد نمائندے وہ ہوتے ہیں جو قانون بنانے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔ سینکڑوں ممبروں کے ایوان میں چند افراد کی کمیٹی بنا دی جاتی ہے جو قانون کا مسوّدہ تیار کرتی ہے۔ اصل واضع قانون یہ کمیٹی ہوتی ہے۔ دس پندرہ فیصد وہ ہوتے ہیں جو قانون کو سمجھتے ہیں باقی تعداد جو سینکڑوں کی ہیبت انگیز اور مرعوب کن تعداد ہوتی ہے۔ اس دس فیصد کی تقلید کرنے والی ہوتی ہے۔

مثلاً جمہوریہ ہند کا دستور اساسی جن پر مفکرینِ ہند کو ناز ہے اور جس کا وہ ساری دنیا میں ڈھنڈورا پیٹتے ہیں بیشک وہ مجلسِ دستور ساز کا منظور کردہ ہے جس کے ارکان کی تعداد تقریباً پانچسو تھی جس میں اقلیتوں کو بھی مناسب نمائندگی دی گئی تھی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کا مسوّدہ ایک کمیٹی نے تیار کیا اور کمیٹی کے ارکان نے بھی سہولت کار کے لیے تدوین اور ترتیب کا کام ایک قابل شخص (ڈاکٹر امبیدکر) کے سپرد کر دیا تھا۔ مسوّدہ تیار کرنے میں کمیٹی کے ارکان بھی وقتاً فوقتاً ان کی مدد کر دیتے تھے۔ بیشک وہ مسوّدہ ارکان کے سامنے پیش کیا گیا۔ اسمبلی کے اجلاس میں اس کی ایک ایک دفعہ پڑھی گئی۔ اس میں ترمیمات بھی ہوئیں، لیکن یہ سب نقش و نگار کی تبدیلیاں تھیں۔ بنیادی ستون وہی رہے جن کی بنیاد ڈاکٹر امبیدکر نے ڈالی تھی۔

اور اگر ہم اس نمائش ہی کو حقیقت گردان لیں اور تسلیم کر لیں کہ دستور اساسی دستور ساز اسمبلی ہی کے ارکان نے مرتب کیا تھا اور ہر ایک رکن وضع قانون اور ترتیب دستور اساسی کی پوری صلاحیت رکھتا تھا۔ اور اس نے تدوین و ترتیب میں پوری توجہ اور دماغ سوزی سے کام لیا۔ تب بھی ظاہر ہے کہ اس دستور اساسی اور اس کی دفعات کی منظوری اکثریت کی رائے پر موقوف تھی اور ایوان میں اگر ایک پارٹی مثلاً کانگرس

کی اکثریت تھی تو یہ دستور اساسی ایک پارٹی کا دستور ہوا اور جمہوریت کا مصداق صرف یہی اکثریت ہوئی۔
پھر یہ ہوسکتا ہے کہ اس پارٹی کے ووٹوں کی مجموعی تعداد مخالفین کی تعداد سے کم ہو۔ مثلاً جمہور کے تیس فیصدی ووٹ کانگرس کو ملے اور ستر فیصدی دوسری پانچ چھ پارٹیوں میں تقسیم ہوگئے تو بیشک ایوان میں اکثریت کانگریس کو حاصل ہوگئی، مگر ظاہر ہے کہ یہ مصنوعی اکثریت تیس فیصدی کی نمائندگی کرتی ہے اور اب جمہور کا اطلاق صرف تیس فی صدی پر ہو رہا ہے۔

یہ دستورُ اساسی کے وضع و ترتیب کی صورت تھی جس کو تمام قوانین میں بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے کیونکہ جملہ قوانین اس ڈھانچہ کا گوشت پوست ہوتے ہیں جو دستور ساز اسمبلی دستور اساسی کی صورت میں تیار کرتی ہے۔

دستور اساسی کے علاوہ عام قانون جو اجلاسوں میں پیش ہوکر منظور ہوتے رہتے ہیں اور جمہوریت کے نام پر انہیں جمہور کے سر تھوپا جاتا ہے ان کے واضعین درحقیقت وہ چند افراد ہوتے ہیں جو کابینہ (CABENET) کے رکن ہوتے ہیں۔ کیبنٹ کا پیش کردہ مسوّدہ قانون پارٹی کو لامحالہ منظور کرنا پڑتا ہے، کیونکہ اسکو مسترد کرنے کے معنی ہوتے ہیں گورنمنٹ پر بے اعتمادی ظاہر کرنا۔ مختصر یہ کہ عوامی حکومت اور جمہور کے اقتدارِ اعلیٰ کے نعرے صرف نمائشی ہوتے ہیں اور حقیقت یہ ہوتی ہے کہ اقتدارِ اعلیٰ چند افراد کے چھوٹے سے حلقے میں سمٹ کر رہ جاتا ہے۔

بے شک اسلام جمہوریت کا حامی ہے بلکہ بانی ہے مگر اس کے معنی یہ ہیں۔

(۱) تمام انسان درجۂ انسانیت میں مساوی ہیں وہ کالے ہوں یا گورے، عرب ہوں یا عجم، مشرقی ہوں یا مغربی سب ایک ماں باپ کی اولاد ہیں۔

(۲) ایک انسان کا درجہ دوسرے انسان سے اگر بلند رہے تو وہ رنگ، نسل، دولت، ثروت یا کسی جغرافیائی بنیاد پر نہیں، بلکہ درجہ اگر بلند ہو سکتا ہے تو صلاحیت اور قابلیت کی بنیاد پر اور اللہ تعالیٰ کے یہاں درجہ کی بلندی تقویٰ کی بنیاد پر ہوتی ہے۔

(۳) بادشاہت، اقتدارِ اعلیٰ کو نسل اور خاندان کے تابع کرتی ہے کہ باپ بادشاہ تھا تو بیٹا بھی بادشاہ ہوگا۔ اسلام اس سے نفرت کرتا ہے۔ ملک الاملاک اور شاہنشاہ جو دنیا میں سب سے زیادہ باعظمت لفظ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں سب سے زیادہ قابلِ نفرت ہے۔ (بخاری شریف ۹۱۶)

وہ اقتدارِ اعلیٰ کو صلاحیت اور قابلیت کے تابع کرتا ہے۔ (البقرۃ آیت ۲۴۷)

(۴) ہر شخص ذمہ دار ہے، وہ اپنی ذمہ داری کے بارے میں جواب دہ ہے۔ غریب ہو یا امیر، حاکم ہو یا محکوم۔

(۵) امام (سربراہِ مملکت) مملکت کا سب سے بڑا ذمہ دار ہے، مگر وہ مشورہ کا پابند ہے اور مسلمانوں کے تمام معاملات مشورہ سے طے پاتے ہیں۔

وضع قانون اگر کسی ایک شخص کو یہ حیثیت نہیں دی جا سکتی کہ وہ خلقِ خدا کا مالک ہو اور جو کچھ وہ کہدے قانون بن جائے اگر اس کو استبداد اور جبر و قہر کہا جاتا ہے تو چند افراد کو بھی یہ حیثیت نہ ملنی چاہیئے کہ وہ قانون ساز بن کر خلقِ خدا کی جانوں اور ان کی ملکیتوں میں تصرف کریں۔ واضع قانون خود تصرف نہیں کرتا، کسی کو پھانسی، کسی کی جان بخشی، کسی کے قید و بند، کسی کے مال ضبط کر لینے اور کسی پر جرمانہ کر دینے کا عمل وہ خود نہیں کرتا، مگر جب ان امور کے ضابطے اور قاعدے مقرر کر کے تصرف کرنے والے کے تصرف کو جائز قرار دیتا ہے تو یہ خود ایسا عمل ہے جس کا دائرہ اثر اس کے اپنے تصرف سے بھی زیادہ وسیع ہے۔

کسی کا گلا گھونٹ کر مار ڈالنا ظالمانہ تصرف ہے۔ مگر اس کا مظلوم یعنی اس سے متاثر ہونے والا صرف ایک شخص ہے، مگر ایسا ضابطہ بنا دینا کہ فلاں عمل کرنے والے کو گولی مار دی جائے اور فلاں عمل کرنے والے کی جائیداد ضبط کر لی جائے۔ ایسا تصرف ہے جس کا تختۂ مشق ایک دو نہیں بلکہ لاتعداد اور بے شمار انسان ہوتے ہیں، کون نہیں جانتا کہ کسی آرڈی ننس کا جاری کر دینا ایسا تصرف ہے جو پورے مُلک کے تمام باشندوں کو متاثر کرتا ہے۔

اسلام جس طرح ملوکیت اور شہنشاہیت کو انسانی بھائی چارے اور انسانی مساوات کے خلاف سمجھتا ہے وہ افرادِ انسان کی کسی جماعت یا کسی کمیٹی کو بھی وضع دستور اساسی کا اختیار دینا مساوات انسانی کے خلاف سمجھتا ہے۔

ان کا علم محدود، مستقبل کی ان کو خبر نہیں، حال پر بھی ان کو پورا اختیار نہیں، وہ انسانی طبقات کے مختلف جذبات سے ناواقف، فطری رجحانات جو ایک ہی نوع کے مختلف حلقوں میں ہوتے ہیں ان سے بھی وہ پوری طرح باخبر نہیں۔ وہ اپنے جیسے انسانوں کے لیے قانون بنائیں اور انکی گردنیں دستوری دفعات کے شکنجے میں کسیں۔ مساواتِ انسانی کا نازک نظریہ اس کو برداشت نہیں کرتا۔ اسی لیے وہ وضع قانون کا

اختیار صرف اس کو دیتا ہے جو حقیقی مالک ہے اور چونکہ وہ خالق ہے لہٰذا وہ ان تمام جذبات و رجحات سے واقف ہے جو انسانوں کے مختلف طبقات اور نوع انسانی کی مختلف صنفوں میں ہوتے ہیں اور چونکہ وہ خالق و مالک ہے اس کو حق ہے کہ اپنی مخلوق کے بارے میں جو چاہے فیصلہ کرے اور جو چاہے ان کے لیے دستور بنائے۔

انسان کا انسان کے لیے قانون بنانا سراسر بے محل اور ایک طرح کا جبر و قہر ہے، اس لیے قرآن حکیم ان سب کو ظالم و فاسق یا کافر قرار دیتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے مرتّب کردہ دستورِ اساسی کے خلاف کوئی دستور بنائیں یا ایسے دستور کو تسلیم کرتے ہوئے فیصلۂ خداوندی کے خلاف کوئی فیصلہ صادر کریں۔

(سورہ مائدہ۔ آیت ۴۴ تا ۴۷)

اس نظریہ اور فکر کے بموجب جب انسان کو قانون سازی کا حق نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے دائرہ اقتدار میں نہ دستور ساز اسمبلی ہوگی نہ آئین ساز کونسل نہ ان کے انتخابات ہوں گے اور نہ وہ بے پناہ مصارف ہونگے جو پارلیمنٹ، کونسل ان کے عہدیداروں، وزراء اور منسٹروں پر ہوتے یا ان کے انتخابات کے سلسلہ میں برداشت کیے جاتے ہیں۔

دستور اساسی | اسلامی نقطہ نظر سے قرآنِ حکیم دستور اساسی ہے جس کی تشریح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات، پھر حضرات خلفائے راشدین کے طریقہ ہائے کار اور جماعتِ صحابہ کے طرزِ عمل نے کی اسی کا نام الشریعۃ الدین اور السنۃ ہے۔

اسی دستور اساسی کی موجودگی میں کوئی اور دستور وضع نہیں کیا جائے گا۔ البتہ پیش آنے والے معاملات کے مطابق اسی دستور کے اصول مسلمہ سے ضابطے اور قاعدے اخذ کیے جائیں گے اور ان کی روشنی میں معاملات کے فیصلے ہوں گے۔

مجلس آئین ساز کے بجائے عدالت عالیہ | اپنی جان، اپنا مال، غیر کی جان اور اس کا مال، رشتہ دار پڑوسی شہری، ملکی غیر ملکی، غیر مسلم وغیرہ کے حقوق، فرائض جرائم کی حیثیت۔ ان کی سزائیں، جنگ و صلح کے بنیادی ضابطے۔ خرید و فروخت، ہبہ، عاریت، اجارہ، تحفظ، نسل، ازدواجی تعلقات وغیرہ کے ضابطے اور اصول قرآنِ حکیم اور سنت نبویہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) نے مقرر کر کے نوع انسان کو وضع دستور اور قانون سازی کی الجھنوں سے آسودہ اور اس کی ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دیا ہے۔ صرف وہ کام باقی

ہے جو کسی قانون کے پیشِ نظر عدالت کو کرنا پڑتا ہے۔

پیش آنے والے معاملات میں ہماری عدالتیں، پارلیمنٹ یا اسمبلی کے وضع کردہ دستور یا قانون کو تلاش کرتی ہیں، اس کا منشا سمجھتی ہیں اور اس کی رہنمائی میں فیصلہ کرتی ہیں۔ اسلامی عدالتیں قرآن اور سنّت کی روشنی میں فیصلہ کریں گی۔

اراضی کی ملکیت، ملکیت کی نوعیت واجبات یعنی پیداوار کے سلسلے میں سرکاری مطالبات، افتادہ اراضی کانوں اور چشموں کی حیثیت، پہاڑ، دریا، ان کی قدرتی پیداوار وغیرہ کے متعلق سوالات پیدا ہوئے۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ نے کتاب اللہ اور سنت رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی روشنی میں ایک مجموعہ قانون مرتّب کر دیا جو کتاب الخراج کے نام سے مشہور ہے۔ خلافت عباسیہ کے دور میں اسی نے آئین کی حیثیت اختیار کر لی۔ پیش آنے والے سوالات کے متعلق مجلسِ قانون ساز کی ضرورت نہیں ہوئی بلکہ اُسی آئین کے مضمرات سے جوابات اخذ کیے گئے اور انہیں کو بائی لاز (BY LYAZ) اور ضمنی قوانین کی حیثیت دی گئی۔

اسلامی نظامِ حکومت کا مقصد | دستور اساسی (کتاب اللہ وسنت رسول اللہ) اور عدالتِ عالیہ کے بعد معاملہ صرف نفاذ کا رہ جاتا ہے، جس کے لیے انتظامی عملہ کی ضرورت ہے۔ مقنّنہ کی نہیں، اسلامی حکومت کا پورا نظام اس لیے ہوتا ہے کہ قانون اسلامی کو نافذ کرے اور جو حکومت اس مقصد کے لیے ہو وہی اسلامی حکومت ہے۔

تشکیلِ حکومت اور سربراہِ مملکت | قرآن حکیم یا احادیث مقدسہ نے تشکیل حکومت کے لیے کوئی خاص ضابطہ مقرر نہیں کیا ہے۔ صرف ایک بنیادی تعلیم دی ہے کہ سربراہ کا تقرر نسل اور خاندان کی بنا پر نہ ہو اہلیت اور صلاحیت کی بنا پر ہو۔ یہ سربراہ کس طرح بنایا جائے۔ کتاب وسنّت نے اس کو بھی موضوعِ بحث نہیں بنایا البتہ سربراہ کے اوصاف بیان کر دیتے ہیں اور اس کے فرائض مقرر کر دیتے ہیں۔ اَب

۱۔ اسلامی مملکت کا سربراہ عوام کی آرا سے بھی منتخب کیا جا سکتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ مدارِ انتخاب وہ اوصاف ہوں جو اسلامی مملکت کے سربراہ میں ہونے چاہئیں جو آغازِ مضمون میں بیان کیے گئے ہیں۔

۲۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ سربراہ جو ان اوصاف کا حامل ہو انتخاب کے قصہ میں نہ پڑے اور خود اپنی جانب سے اپنا کوئی ایسا قائم مقام نامزد کر دے جو اِن اوصاف کا حامل ہو اور عوام میں متعارف ہو۔

۳۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سربراہ جو اوصاف سربراہی کا صحیح طور پر حامل ہو اپنی جانب سے کچھ اہل الرائے

حضرات کو نامزد کر دے کہ وہ آئندہ کے لیے کوئی سربراہ نامزد کر دیں جو اوصاف سربراہی سے متصف ہو۔

اسلام جبر و قہر کی اجازت نہیں دیتا، لیکن اگر کوئی اپنی طاقت کے بل بوتے پر سربراہ بن جائے تو مسلمان اس کی قیادت تسلیم کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کرے اور ایسے اوصاف کا حامل ہو جو فرائض ادا کرنے کے لیے ضروری ہیں۔

مشورہ اور ارکانِ مشورہ (شوریٰ) اسلام نے جس طرح تشکیلِ حکومت کو کسی خاص نوعیت کے ساتھ مخصوص بیان کیا اسی طرح ارکانِ شوریٰ کے انتخاب یا نامزدگی کا بھی کوئی ضابطہ مقرر نہیں فرمایا اور واقعہ یہ ہے کہ جن امور کا تعلق الٰہیات (اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات) اور عبادات سے نہیں ہے بلکہ ان کا تعلق تجربات اور مشاہدات سے ہے۔ اسلام نے ایسے امور میں فکرِ انسانی کو آزاد چھوڑا ہے۔ بہرحال اگرچہ ارکان شوریٰ کے انتخاب وغیرہ کے بارے میں کوئی ضابطہ مقرر نہیں کیا، مگر سربراہ پر یہ لازم کر دیا ہے کہ وہ اپنے ہر ایک منصوبہ کے متعلق مشورہ کرے عمل کرنے کا عزم اس وقت کرے جب پہلے مشورہ کر لے ۔ پہلے مشورہ ۔ پھر خدا پر بھروسہ ان دو کے بیچ میں عزم ہونا چاہیئے ۔ (سورہ ۳ آل عمران ۔ آیت ۱۵۹)

پھر مشورہ کو یہاں تک اہمیت دی ہے کہ اس معاملہ کو مسلمانوں کا معاملہ ہی نہیں قرار دیا جو آپس کے مشورہ سے طے نہ ہو۔ (سورہ شوریٰ آیت ۳۸)

جب کہ مجلس شوریٰ کے لیے کوئی ضابطہ مقرر نہیں، تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ :

۱۔ ارکانِ شوریٰ کا انتخاب عوام کی رائے سے ہو۔ بشرطیکہ مدارِ انتخاب ان کے وہ اوصاف ہوں جو اسلامی مملکت کے مشیر کے ہونے چاہئیں۔

۲۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ الگ الگ انتظامی حلقے ہوں اور ان حلقوں کے سربراہ پوری مملکت کے سربراہ کا انتخاب کریں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مسعود میں کچھ حلقے ہوتے تھے ان حلقوں کے سربراہ کو نقیب کہا جاتا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسیران ہوازن کے متعلق عوام کی رائے معلوم کرنی چاہی تو مجمع عام میں جو پکار دیا گیا تھا کہ "ہم راضی ہیں" اس پر اعتماد نہیں فرمایا بلکہ ان عرفاء (امیرانِ قبیلہ یا محلّہ) کو ہدایت فرمائی کہ وہ اپنے طور پر اپنے اپنے حلقے میں فرداً فرداً ہر ایک کی رائے معلوم کریں جب ان کی رپورٹیں موصول ہو گئیں تب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا (بخاری شریف ص ۳۵۵ وغیرہ)

۳- اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ سربراہ مملکت ان لوگوں کو خود نامزد کر دے جو ووٹنگ کے ذریعہ نہیں بلکہ اپنے اخلاق، کردار، اپنی قابلیت، صلاحیت اور خدمات کی وجہ سے اُوپر آچکے ہوں اور بہتر کردار کے مالک ہونے کی وجہ سے وہ ممتاز شخص بن چکے ہوں۔

۴- ایک شکل یہ بھی ہوسکتی ہے کہ نامزد یا منتخب کسی کو بھی نہ کیا جائے بلکہ ہر پیش آنے والے معاملے میں، اس معاملہ سے تعلق رکھنے والے صاحبِ بصیرت اور تجربہ کار حضرات کو دعوت دی جائے اور ان سے فیصلہ کرایا جائے۔

کتاب وسنت کے اشارات کے بموجب سب سے اہم اور سب سے بنیادی بات سربراہ کا "تقویٰ" ہے اس کے دل میں خدا کا خوف ہو۔ نوعِ انسانی اور خدا کا ہمدرد ہو، صاحبِ بصیرت، دیانتدار، باحوصلہ اور بیدار مغز ہو اور فرائض کی لگن رکھتا ہو۔

اگر مملکت کو اس طرح کا سربراہ میسّر آگیا ہو تو نہ اس کو پارلیمنٹ کی ضرورت ہے۔ نہ مجلسِ وزراء کی۔ خصوصاً نمبر ۳ و نمبر ۴ والی صورتیں اس وقت صحیح قرار دی جاسکتی ہیں، جب سربراہ میں اخلاص، کردار اور پاکبازی ہو۔ مقصد یہ ہے کہ باخدا اور خداترس ڈکٹیٹر ہزاروں پارلیمنٹ اور اسمبلیوں سے بہتر ہے۔ خوفِ خُدا نہ ہو تو سب بے کار۔

شوریٰ کا کام | بیشک قانون اور دستور بنانا شوریٰ سے متعلق نہیں ہے، مگر نفاذِ دستور کے سلسلہ میں بہت سے مرحلے ایسے آتے ہیں جس کو اگر شوریٰ کے بغیر امام اور سربراہ اپنی رائے سے طے کر دے تو جبر و قہر اور استبداد قرار دیئے جائیں گے۔ ان میں نہ صرف شوریٰ کی ضرورت ہوگی بلکہ یہ بھی ضروری ہوگا کہ ارکانِ شوریٰ بارسوخ ہوں، عوام کے مزاج کو پہچانتے ہوں اور عوام بھی ان پر اعتماد کرتے ہوں، ان کی رائے عوام کی رائے ہو اور فی الواقع عوام کے ترجمان ہوں۔

مثال | صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے جس سے شوریٰ کی ضرورت، اس کی نوعیت اور اس کے فرائض کا اندازہ ہوجائے گا۔

سورہ انفال کی آیت ۶۰ کا مفاد یہ ہے کہ "مسلمانوں کو بین الاقوامی سیاست کے اسٹیج پر اس طرح بالادست ہوکر رہنا چاہیئے کہ دوسری قومیں اس سے متاثر رہیں اور اس کے لیے جس قسم کے سازوسامان کی ضرورت ہے مسلمانوں پر فرض ہے کہ اس کو تیار رکھیں"۔

آج دنیا میں روس اور امریکہ کے درمیان سرد جنگ جاری ہے۔ ہر ایک بلاک دوسرے کو مرعوب کر رہا ہے۔ یہ میدان مُسلمانوں سے خالی ہے۔ بین الاقوامی سیاست میں مسلمانوں اور ان کی تمام مملکتوں کا شمار پسماندہ اقوام میں ہوتا ہے۔ حاشا وکلّا قرآن حکیم مسلمانوں کے لیے یہ ذلّت گوارا نہیں کرتا۔ قرآن پاک کی تلقین یہ ہے کہ "کلمۃ اللہ ہی العلیا" اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو یہ نعرہ دیا تھا الاسلام یعلو ولا یعلی علیہ (اسلام بلند ہو کر رہتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ دوسروں کو اسلام پر بلندی حاصل ہو) سائنسی تحقیقات اور ترقی کا کام دوسروں نے لے لیا۔ اسی راستہ سے وہ دنیا پر چھائے ہوئے ہیں اور تمام دنیا کو مرعوب کر رہے ہیں۔ قرآن حکیم کی تعلیم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے بموجب اسلامی حکومت کو ایسا بیدار مغز ہونا چاہیئے کہ اس میدان میں بھی اس کا قدم سب سے آگے رہے۔ وہ کسی کے دست نگر نہ رہیں دوسروں کو ان کا دست نگر رہنا چاہیئے۔

وہ اللہ کے سوا کسی دوسرے سے خائف نہ ہوں۔ دوسروں پر ان کی دھاک رہنی چاہیئے۔ (سورۃ ۹ توبہ آیت ۱۲۳)

اس ترقی اور برتری کے لیے بہت زیادہ دولت کی ضرورت ہے۔ زکوٰۃ و صدقات اور عشر جو خوشحال مسلمانوں پر فرض ہوتے ہیں۔ وہ ضرورت مند، عیال دار، فقراء و مساکین کا حصہ ہیں۔ ان کی رقومات ان مدات پر ہی خرچ کی جائیں گی۔ ترقی اور استحکامِ قوت کے مدات پر خرچ نہیں ہو سکتیں۔

خراج جزیہ اور اسلامی تعلیم کے بموجب عشور یعنی درآمد و برآمد مال کے ٹیکس اور اس طرح کے معینہ مدّات کی آمدنی اگر ان ضرورتوں کے لیے ناکافی ہو (جو ترقی پذیر تعلیم و تربیت اور ریسرچ و تحقیقات اور سامان جنگ کی فراہمی وغیرہ کے سلسلے میں رونما ہوں) تو مجلس شوریٰ یہاں اپنا فرض انجام دے گی یعنی ماہرین کی امداد سے ذرائع آمدنی میں اضافہ کرے گی۔

کارخانے اور فیکٹریاں | یہ کوئی اچھی بات نہیں کہ لوگ اپنی محنت اور اپنی گاڑھی کمائی سے کارخانے اور مِل قائم کریں اور حکومت ان کو نیشنلائز کر کے اپنے قبضہ میں لے لے، حکومت کو غاصب نہ ہونا چاہیئے بلکہ حکومت کو ایسا فرض شناس ہونا چاہیئے کہ وہ پہلے ہی اپنی طرف سے بڑے بڑے کارخانے قائم کر کے اپنی آمدنی میں اضافہ کر لے۔

ترقیاتی پلان اور منصوبے آج بھی پارلیمنٹ اسمبلی یا مجلس وزراء نہیں بناتی۔ بنانے والے اور ہوتے ہیں پارلیمنٹ ان کی منظوری دیتی ہے۔ کیا اچھا ہو کہ شوریٰ کے ارکان وہ ماہر ہوں جو اس طرح کے منصوبے بنا

سکیں آخر ایسے ہی ماہرین کو شوریٰ کا (پارلیمنٹ کا) ممبر کیوں نہیں بنایا جاتا، کیا وہ عوام کی ضرورتوں اور رجحانات سے بے خبر ہوتے ہیں؟ وہ عوام کی نمائندگی کیوں نہیں کر سکتے۔

خسارہ پورا کرنیوالا آمدنی کا ایک مَدّ قرآن حکیم نے ایک مستقل مد قرار دیدیا ہے۔ انفاق فی سبیل اللہ (راہِ خدا میں خرچ کرنا) چنانچہ سورۂ انفال کی مذکورہ بالا آیت کا آخری حصہ یہ ہے۔

اللہ کے راستہ میں جو کچھ تم خرچ کرو گے وہ تم کو پورا پورا ادا کیا جائے گا اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ (انفال آیت ۶۰)

سورۂ محمدؐ کی آخری آیت کا مفہوم یہ ہے۔

تم کو دعوت دی جارہی ہے کہ تم راہ خدا میں خرچ کرو۔ تم میں سے کچھ وہ ہیں جو اس دعوت کے جواب میں بخل سے کام لیتے ہیں (خرچ نہیں کرتے) دیکھو یہ اگر بخل کرتے ہیں تو اپنے سے (اپنے مفاد سے) بخل کر رہے ہیں۔ اللہ کو ضرورت نہیں، وہ بے نیاز ہے۔

(اعلیٰ تعلیم، ترقی پذیر تربیت، سائنسی ایجادات و ترقیات یہ تمہاری ضرورتیں ہیں) تم ہی ضرورتمند ہو (خود تمہاری باعزت بقاء کے لیے ان کی ضرورت ہے)

اگر تم منہ موڑتے ہو تو تم ختم ہو جاؤ گے اللہ تمہارے بدلہ میں کسی دوسری قوم کو کھڑا کرے گا جو تم جیسی تن آسان، فرض ناشناس اور مفاد پرست نہیں ہوگی۔

سورہ بقرہ میں جنگ و قتال کے متعلق ہدایات دینے کے بعد ارشاد ہے:۔

خرچ کرو اللہ کے راستہ میں اور نہ ڈالو اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں بربادی اور ہلاکت میں (آیت ۱۹۵)

قرآن حکیم میں اس انفاق فی سبیل اللہ کو "قرض حسن" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یہ گویا قومی یا ملّی قرض ہوتا ہے۔ ہماری حکومتیں بھی قومی یا جنگی قرض لیتی ہیں جن کا سود بھی ادا کرتی ہیں، مگر اس سود کے نتیجہ میں ان قومی اور جنگی قرضوں کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ دولت مند جو قرض دینے والے ہیں ان کی دولت بڑھ جاتی ہے اور اس تمام قرض کا بار ملک کے تمام غریب ٹیکس دینے والوں پر پڑتا ہے دولت مند یہ قرض دے کر بظاہر قوم کی خدمت کر رہا ہے، لیکن فی الحقیقت قوم کا خون چوس رہا ہے اور

اپنی امیری بڑھا رہا ہے۔ قرآن حکیم جس قرض کا مطالبہ کرتا ہے اس کا کوئی بار غریب اور محنت کش طبقہ پر نہیں پڑتا۔ صرف دولت مند پر اس کا بار پڑتا ہے۔ اسی کی گرہ میں سے اس کی خالص پونجی خرچ ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ وعدہ بھی ہے۔

"کہ تم کو پورا پورا ادا کیا جائے گا اور تم پر ظلم نہیں ہوگا۔" (سورہ انفال آیت ۶۰)

اس پورا پورا ادا کرنے کی شکل یہ ہے کہ ترقیات کے مفادات سے یہ دولت مند بھی بہرہ اندوز ہوں گے۔

چنانچہ :-

جن صحابہ کرام (رض) نے ارشاد خداوندی کی تعمیل کرنے کے لیے خرچ کیا تھا ان میں بہت سے وہ بھی تھے کہ ثواب آخرت کے علاوہ دنیا میں بھی ان کو پورا پورا بلکہ پورے سے بھی بہت زیادہ ادا کر دیا گیا۔

حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کی حالت ابتداء زمانہ میں یہ تھی کہ ان کی اہلیہ محترمہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا اونٹ کے چارے اور چولھے کے سوختے کے لیے گٹھلیوں وغیرہ کا بار دو تین میل کے فاصلہ سے خود اپنے سر پر رکھ کر لایا کرتی تھیں مگر تقریباً تیس سال بعد جب وہ شہید ہو گئے تو ان کا ترکہ پانچ کروڑ سے زیادہ کا تھا جو قطعاً جائز اور پاک آمدنی سے حاصل ہوا تھا۔ جبکہ تمام غزوات میں پیش پیش رہے تھے۔ اور کروڑوں درہم راہ خدا میں خرچ کیے تھے۔ (بخاری شریف ص ۴۴۱، ۴۴۲)

دوسری شکل اور پورا پورا ادا کرنے کی دوسری شکل یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کے مدارج اتنے بڑھائے جائیں کہ ان کا اندازہ لگانا مشکل ہو۔ وہ اس زمرہ میں ہوں جن کو اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کی طرح "منعم علیہم" فرمایا ہے اور ان کو ابدی حیات کی بشارت دی ہے

بہرحال اس قرض کی ادائیگی باشندگان ملک کی جیب سے نہیں ہوگی۔ ارکان شوریٰ کا فرض ہوگا کہ اسلامی مملکت کی ترقی پذیر ضرورتوں کا جائزہ لیں۔ ان کا بجٹ بنائیں۔ بجٹ کو پورا کرنے کے لیے قرض حسن حاصل کریں۔ دولت مندوں کا فرض ہوگا کہ جو ان کے ذمہ کیا جائے وہ اس کو خوشدلی سے ادا کریں یہ ان کے لیے ذخیرۂ آخرت ہوگا۔ زکوٰۃ کی طرح اس کی ادائیگی بھی فرض ہوگی اور زکوٰۃ کی طرح اس کا ثواب بھی بیش از بیش ہوگا جسکی تائید بے شمار آیات اور احادیث سے ہوتی ہے۔

اس قرض للہ اور فی سبیل اللہ کی شرح کیا ہوگی۔ اگر امام از خود کسی آرڈی ننس سے طے کر دیتا ہے تو ایک طرح کا جبر ہوگا، لیکن اگر ارکان شوریٰ جو بااثر اور بارسوخ بھی ہوں وہ طے کرتے ہیں تو سب کے لیے قابلِ برداشت ہوگا۔

اسی طرح ترقی پذیر اعلیٰ تعلیم اور تربیت کی ضرورتیں ہیں۔ ان کے مصارف بھی ایسی ہی آمدنی یا قرض للہ

سے پورے کیے جائیں گے۔ شوریٰ کا فرض ہوگا کہ ان تمام ضرورتوں کا جائزہ لیکر بجٹ بنائے۔ ممکن ہے اس کو قانون سازی کہہ دیا جائے۔ مگر ہمارے خیال میں یہ قانون اور "لا" نہیں بلکہ یہ حکم خداوندی کے نافذ کرنے کی صورتیں ہیں۔

دولت کا اندازہ | زکوٰۃ کی رقم ان مدات میں خرچ نہیں کی جائے گی، البتہ زکوٰۃ سے دولت کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ جس نے ایک ہزار روپیہ زکوٰۃ میں دیا ہے اس کا کل اثاثہ چالیس ہزار ہوگا۔

بہر حال اس قسم کے کام ہوں گے جن کو ارکان شوریٰ زیرِ قیادت امام انجام دیں گے۔ (یہ ہے اسلامی نظام حکومت کا مختصر خاکہ)

اس تاریخی حقیقت پر سلسلۂ کلام کو ختم کیا جاتا ہے کہ خاتم الانبیاء محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو رحمۃ للعالمین بنا کر مبعوث کیے گئے تھے۔ سب سے پہلے آپؐ ہی نے دفاع کے لیے خندق کی تجویز منظور فرمائی۔ عرب اس سے قطعاً نا آشنا تھے۔ جب حملہ آوروں نے جن میں تقریباً پورے عرب کے قبائل تھے دفاع کا یہ نیا طریقہ دیکھا تو حیران رہ گئے۔ اگرچہ فتح نصرتِ خداوندی سے ہوئی، مگر یہ خندق دشمن کی ناکامی کا پیش خیمہ بن گئی۔

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے سب سے پہلے منجنیق اور دبابہ کو استعمال کرایا جب آپؐ قلعہ طائف پر حملہ کر رہے تھے، یہ اس زمانہ کے ترقی یافتہ آلاتِ حرب تھے جن کو تاریخِ اسلام میں سب سے پہلے رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے استعمال فرمایا، کیونکہ مقصد رحمت اس وقت تک پورا نہیں ہوتا جب تک ظلم کی طاقتیں پامال نہ ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ تمام عالم پر چتر رحمت اسی وقت سایہ فگن ہو سکتا ہے۔ جب بین الاقوامی سیاست میں بالادستی اور شان قیادت حاصل ہو۔ ہم سود کو بدترین ظلم سمجھتے ہیں۔ مگر ہم تمام احتیاطوں کے باوجود سود لیتے بھی ہیں اور دیتے بھی ہیں، کیونکہ جس اقتصادی نظام میں ہم جکڑ بند ہیں وہ بینک سسٹم ہے اور جب تک اقتصادیات عالم کی باگ ڈور آپکے ہاتھ میں نہ ہو آپ بینک سسٹم ختم کر کے کوئی متبادل نظام قائم نہیں کر سکتے۔

سود کے متعلق قرآن حکیم کا فیصلہ دستور اساسی کی ایک دفعہ ہے۔ مجلس شوریٰ اس میں تبدیلی نہیں کر سکتی البتہ متبادل صورتیں طے کرنا اور انکو نافذ کرنا اس کا فرض ہوگا۔ مگر افسوس اسوقت دنیا میں مسلمانوں کی کوئی حکومت بھی اس قابل نہیں کہ بین الاقوامی سیاست پر اثر انداز ہو سکے اور افسوس یہ ہے کہ ان کو اس کا احساس بھی نہیں کہ حامل قرآن ہونے کی حیثیت سے ان کا کیا فرض ہے۔ والی اللہ المشتکی۔

◆◆

انوارِ مدینہ

حضرۃ مولانا محمد موسیٰ روحانی بازی استاذ حدیث جامعہ اشرفیہ لاہور

○

نبیؐ کا باغ انوارِ مدینہ — کتابِ نورُ انوارِ مدینہ
فروغِ دین انوارِ مدینہ — شکوہِ شرع انوارِ مدینہ
حیاتِ قلب و پیغام مدینہ — پیامِ وصل انوارِ مدینہ
ہوئی سیراب کشتِ علم و حکمت — طفیلِ فیضِ انوارِ مدینہ
جو بھٹکے پھر رہے تھے ظلمتوں میں — ہے ان کی شمع انوارِ مدینہ
وہ جنکی آستیں میں بت چھپے تھے — ہے ان پر ضرب انوارِ مدینہ
اگر ذوقِ مے آشامی ہو حاصل — تو بھر ساغر زِ انوارِ مدینہ
اٹھا وہ ابرِ مدنیؒ کے چمن سے — کہ برسے اُس سے انوارِ مدینہ
ہلالِ دین اور مہتابِ قرآن — عروسِ علم انوارِ مدینہ
ہوئی دین آشنا ارضِ صحافت — بفیضِ نورِ انوارِ مدینہ
دبستانوں میں جن کا نور چمکا — ہے وہ قندیل انوارِ مدینہ
حسین احمدؒ کا گلشن اللہ اللہ — ہے اِک گلدستہ انوارِ مدینہ

جہاں ہمدوش ہیں وعد اور وعیدیں
وہ بزم و رزم انوارِ مدینہ

زکوٰۃ ، صدقات اور ہمہ قسم عطیات کا صحیح مصرف

جامعہ مدنیہ

محترم الحاج محمود احمد عارف
خازن جامعہ مدنیہ

جامعہ مدنیہ لاہور ان مدارس میں سے ایک ہے جو دین حقہ کے تحفظ و اشاعت کی غرض سے معرضِ وجود میں آئے ہیں۔ اس کا شمار ملک کے عظیم دینی اداروں میں ہوتا ہے۔ اس کی ابتداء ۱۳۷۵ھ مطابق ۱۹۵۵ء میں ہوئی تھی۔ گویا اس وقت جامعہ زندگی کی ۱۶ بہاریں پوری کر کے ۱۷ ویں میں داخل ہو رہا ہے۔ اس مختصر سے عرصہ میں جامعہ نے سینکڑوں علماء اور کثیر تعداد میں حفاظ اور قراء تیار کیے۔ اس وقت بفضلہٖ تعالیٰ جامعہ کی اپنی مستقل خوبصورت اور شاندار عمارت ہے۔ درسِ نظامی کا مکمل انتظام ہے۔ اس سال (۱۳۷۲ھ) تقریباً پانچ سو طلبہ نے قابل و لائق اساتذہ کی زیرِ نگرانی مختلف شعبوں میں تعلیم حاصل کی۔ ان میں ایک سو سے زائد طلبہ کے خورد و نوش وظائف، کپڑوں اور دیگر جملہ مصارف کا جامعہ کفیل رہا۔

اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ علوم اسلامیہ کا یہ عظیم مرکز بیش از بیش علمی خدمات انجام دے تو آپ خود بھی اس نیک کام میں معاون بنیے اور اپنے احباب اور متعلقین کو بھی اس کارِ خیر میں حصّہ لینے کی ترغیب دیجیے۔

معاونت کی مختلف صورتیں | ا : حسبِ حیثیت ماہانہ چندہ دینا۔

ب : زکوٰۃ۔ عشر اور صدقات وغیرہ جمع کرانا

ج : اناج، کپڑا، بستر وغیرہ جمع کرانا۔ د : تعمیر میں حصہ لینا۔ ہ : کتابیں مہیا کرنا۔

و : نیز بعض حضرات کسی رشتہ دار وغیرہ کے ایصالِ ثواب کی غرض سے غریب طلبہ کو کھانا کھلانا پسند کرتے ہیں تو جامعہ میں اس کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ بیس روپے فی کس کے حساب سے آپ ایک طالب علم کا یا ایک سے زائد طلبہ کا اپنی طرف سے کھانا جاری رکھ سکتے ہیں۔

رجب کے مہینے میں جب آپ زکوٰۃ ادا کریں تو جامعہ مدنیہ کو فراموش نہ فرمائیے

تبصرہ

اسلام میں سنّت وحدیث کا مقام | یہ کتاب مصر کے ایک عظیم استاذ ڈاکٹر مصطفیٰ حسنی السباعی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ہے جو انہوں نے جامعہ ازہر کے کلیۂ شریعہ میں ایم اے عالمیہ کی ڈگری حاصل کرنے کی غرض سے بصورت مقالہ پیش کی تھی

ان کی یہ تحریر تیس سال بعد ۱۳۸۰ھ میں کتابی شکل میں شائع ہوئی اسکی جلد اوّل جسکا ترجمہ "اسلام میں سنّت و حدیث کا مقام" کے عنوان سے شعبۂ تصنیف وتالیف مدرسہ عربیہ اسلامیہ کراچی نمبر ۵ نے شائع کیا ہے ۵۳۹ صفحات پر مشتمل ہے۔

اس کا اردو ترجمہ مدرسہ عربیہ اسلامیہ کے فاضل ڈاکٹر مولانا احمد حسن صاحب ٹونکی نے کیا اور مولانا محمد ادریس صاحب میرٹھی مدظلہم نے نظر ثانی فرمائی اور اسے تعلیقات سے آراستہ کیا۔

یہ کتاب علم حدیث پر اعتراضات کے علمی جوابات پر مشتمل ہے اس میں یہودی اور عیسائی مستشرقین خصوصاً گولڈزیہر کی مجرمانہ خیانتوں کا پردہ چاک کیا گیا ہے۔ علم دوست حضرات کے لیے یہ قابلِ مطالعہ تحفہ ہے۔

عدالتِ حضراتِ صحابۂ کرامؓ | اس کتاب پر بڑے بڑے حضرات مثلاً حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری حضرت مولانا مفتی محمود صاحب اور حضرت مولانا محمد سرفراز خانصاحب صفدر کی تقاریظ ہیں۔ یہ کتاب ۳۶۰ صفحات پر مشتمل ہے اور مکتبہ عثمانیہ ۴/۴ اے پاک کالونی منگو پیر روڈ کراچی نمبر ۱۶ سے طبع ہوئی ہے۔ گتے کی جلد ہے اور قیمت ساڑھے سات روپے ہے۔ اس کے تعارف کے لیے ہم حضرت مولانا محمد سرفراز صاحب صفدر ہی کی تحریر کا کچھ اقتباس پیش کرتے ہیں ——— "پیشِ نظر کتاب "عدالت حضرات صحابہ کرامؓ" جو فاضل نوجوان فائق علی الاقران الحافظ المولوی مہر محمد صاحب فاضل مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ و فاضل تخصص فی الحدیث مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیوٹاؤن کراچی کی تالیف لطیف ہے جس میں قرآن کریم۔ احادیث اور کتب دینیہ کے صریح اور برمحل حوالے موتیوں کے طرح چمکتے ہیں۔ جس میں انہوں نے حضرات صحابہ کرامؓ پر کیے گئے بے بنیاد اعتراضات کا علمی اور تحقیقی طور پر جائزہ لیا ہے اور خاص علمی اور تحقیقی زبان میں اپنے دلائل پیش کیے اور معترضین کو جوابات دیئے

ہیں اور مدافعت کا بفضلہ تعالیٰ کافی حق ادا کیا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ کی محض عدالت ہی نہیں دیکھنی تاکہ اس کے اثبات کے لیے سلف صالحینؒ کے چند حوالوں پر اکتفا کر لی جائے۔ بلکہ عدالت سے آگے بڑھ کر یہ بھی دیکھنا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے ان کے حق میں یہ بھی ارشاد فرمایا ہے۔

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرَّاشِدُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ۔	اور لیکن اللہ تعالیٰ نے محبوب کیا تمہارے لیے ایمان اور اس کو تمہارے دلوں میں مزین کیا اور ناپسند بنایا تمہارے لیے کفر اور گناہ اور نافرمانی اور وہ لوگ وہی ہیں نیک راہ پر اللہ تعالےٰ کے فضل اور اسکے احسان سے اور اللہ تعالےٰ سب کچھ جانتا حکمتوں والا ہے۔
(پ ۲۶ الحجرات)	

قرآن کریم کا یہ مضمون صریح طور سے اس پر دلالت کرتا ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ کے دلوں میں اللہ تعالےٰ نے ایمان کی محبت ڈالی اور اس کو ان کے دلوں میں مزیّن کیا ہے اور ان حضرات کے لیے اللہ تعالیٰ نے کفر گناہ اور نافرمانی کو ناپسند کیا ہے اور یہ حضرات راہ راست پر گامزن ہیں اور یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور اس کی مہربانی ہے اور اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر علم و حکمت والا اور کون ہو سکتا ہے؟

اب جو شخص ان نفوس قدسیہ کی طرف کفر اور گناہ اور نافرمانی کی نسبت کرتا ہے۔ اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کے اس صریح ارشاد کی معاذ اللہ تعالیٰ کوئی وقعت نہیں ہے۔ وہ شخص اپنا مقام اور اس سے بڑھ کر اپنا انجام خود سوچے کہ کیا ہوگا؟

فاضل مؤلف نے اس پہلو پر زریں حوالوں سے خوب روشنی ڈالی ہے اور بعض ایسی کتابوں کے حوالے بھی دیئے ہیں جو کافی محنت اور جستجو کے بعد مہیا ہو سکتے ہیں۔ علماء کرام اور طلبہ عظام کے لیے یہ بیش بہا نادر تحفہ ہے۔ اور انمول موتی ہیں۔

فاضل مؤلف کی چونکہ یہ پہلی تصنیف ہے اور وہ نوعمر ہونے کے ساتھ فن تالیف میں نوآموز بھی ہیں۔ اگر بعض مقامات پر کسی صاحبِ علم کو تقریب تام نظر نہ آئے یا جدید ادب کی چاشنی اس کو نہ ملے یا ترتیب مضامین یا اس کی کتابت (جس پر خود فاضل مؤلف نے کتابت سیکھنے کے بعد مشق کی ہے) یا

طباعت وغیرہ کی کچھ کمی محسوس ہو تو اس کو درخورِ اعتناء نہ سمجھے بلکہ نگاہ مقصود پر رکھے۔ اس میں بہت زیادہ علمی سرمایہ موجود ہے اور یہ اہلِ علم کے لیے انشاء اللہ العزیز بہت ہی مفید رہے گا۔ انشاء اللہ العزیز وہ طبع دوم میں اغلاط کی اصلاح اور سلاست اور تقریب تام کو زیادہ محفوظ رکھیں گے۔

ہماری دعاء ہے کہ ع

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

شرابِ خانہ خراب اس میں کیا شک ہے کہ یہ بلا خانہ خراب ہے۔ اس نے ہی پاکستان کو تباہ کیا اور تمام دنیا کے مسلمانوں کو پاکستان کی شکست سے اقوامِ عالم کے سامنے ذلیل و خوار کیا۔ اس کی خرابیاں واضح کرنے کے لیے خطیبِ پاکستان حضرت مولانا محمد اجمل صاحب مدظلہم نے قلم اٹھایا اور ایک مختصر مگر نہایت جامع و مفید رسالہ دلچسپ انداز میں تحریر فرمایا جو پینتیس صفحات پر مشتمل ہے۔ کاغذ و طباعت و کتابت نہایت عمدہ ہے۔

ناشر: مکتبۂ اشاعت اسلام جامعہ مسجد رحمانیہ قلعہ گوجر سنگھ عبدالکریم روڈ لاہور۔ ہے

"انوارِ مدینہ" میں

اشتہار

دے کر اپنی تجارت کو فروغ دیجئے۔

جامعہ مدنیہ ○ کریم پارک ○ راوی روڈ ○ لاہور